وہ

ناولٹ

تمام عمر دیا ہم نے زندگی کو فریب
اب ایک سانس بھی مشکل ہے کیا کیا جائے

تاریخ و سنِ اشاعت ... ... ۵ر نومبر ۱۹۹۵ء

بارِ اوّل ۵۰۰

کتابت ... ... شفیع اقبال

طباعت ... ... اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد ۲

ناشر ... ... فاطمہ تاج

ترتیب و تزئین ... ... فاطمہ تاج

قیمت: ۲۵ روپے

:: کتاب ملنے کے پتے ::

- حسامی بک ڈپو۔ مچھلی کمان۔ پتھر گٹی۔ حیدرآباد ۲...۵۰۰
- الکتاب ۔ میور کوشل۔ عابڈس۔ گن فاونڈری۔ رویرو اسٹیٹ بنک۔ A-110، حیدرآباد۔
- مکتبہ جامعہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔
- مصنفہ: ۲۲-۳-۳۳۹، میر چوک۔ گھر باؤلی۔ حیدرآباد ۲

فون نمبر: 521943

اِنتساب

فکر و نظر کے اُس لمحے کے نام
جس کی دسترس میں
ساری کائنات ہے ....

فاطمہ تاج

"پھر وہی بات"

جب تخیّل کے دبیز پردے جنون پرور ایک جھونکے سے چاک ہو جاتے ہیں تو فرزانگی کا چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے۔ قلمکار، جو تخلیقاتی دنیا کے خالق ہیں، کسی بھی وجود کی تخلیق بہ آسانی کر لیتے ہیں۔ کسی کردار کا وجود ہو کہ نہ ہو، فنکار کا تخیّل تو برائے تخلیق ہی ہوتا ہے۔ فنکار کسی مادّی شئے کی تلاش میں وقت ضائع کئے بغیر اپنے تصور کو مجسّم شکل اور حیاتِ جاوداں دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ویسے بھی زندگی کو قسطوں میں تقسیم کرنے سے بہتر ہے کہ ہر سانس کا احترام کیا جائے تاکہ اپنی ذات کا تحفظ ہو سکے ــــ!

کتنا عجیب تھا وہ لمحہ جب بیٹھے بیٹھے اک دم سے چونک پڑی یوں لگا جیسے کہ برقی رَو چھو گئی ہو، قلم اور کاغذ لے کر بیٹھ گئی تھوڑی ہی دیر میں ناولٹ "وہ" تیار تھا۔ اس مختصر سے ناولٹ کے لئے نام بھی مختصر سا ذہن میں آیا اور میرے قلم نے ایک ایسے کردار کو تخلیق کیا جو قارئین کو کہیں نہ کہیں مجسّم لگے گا۔ کبھی محوِ گفتگو، کبھی خاموشی کے

حصار میں، کبھی دھوئیں کے مرغولوں کے درمیان تو کبھی دانشوری کے جالی
میں.....! سازش! میں کبھی ابنِ صفی، کی طرح فرضی کرداروں کو حیات
جاوداں دے سکتی ۔!!!

افسانوی دنیا میں زیادہ تر فرضی کردار ہی ہوتے ہیں اس کے
باوجود لگتا ہے کہ وہ حقیقی کردار ہیں اور ہمارے آس پاس ہی ہیں....

میں نے کوشش تو کی ہے کہ مرکزی کردار کو قارئین کے ذہن میں کہیں
پناہ مل جائے ــــ "وہ" دراصل "میں" کی نشاندہی کرتا ہے اور لفظ
"میں" کائنات پر محیط ہی نہیں بلکہ کائنات کی تخلیق کا سبب بھی ہے۔

"وہ" پورے ناول میں "وہ" ہی ہے اس سفر میں کہیں اُس
کا نام نہیں صرف اُس کی گفتگو اور دوسرے کردار سے اُس کا اتفاقی ٹکراؤ
ــــ!

خوشگوار اور فکر و نظر سے بھرپور گفتگو میں اپنے خیالات کا اظہار
کرنے میں، میں کامیاب ہو سکی یا نہیں؟ یہ فیصلہ قارئین ہی کر سکیں گے۔

"میں" کی اہمیت کے لئے "وہ" بہت ضروری ہے اور "وہ" کی اہمیت کو
میں نے دیانت داری سے اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ "وہ" کا پُراسرار کردار
اس کہانی کے اختتام ہی پر وضاحت کی منزلیں طے کرتا ہے۔

کسی کی بھی ذات میں خواہ کتنی ہی اُلجھنیں ہوں لیکن "سرے" بہرحال وہ ہوتے ہیں جنہیں ہم کبھی سُلجھا بھی لیتے ہیں اور نہ سُلجھا سکنے پر ذات کی بہتی ڈوری کو جگہ جگہ سے توڑ کر گرہ لگاتے جاتے ہیں اور ذات کا تسلسل باقی رکھتے ہیں چاہے وجود کتنا ہی ٹوٹا پھوٹا اور زخمی کیوں نہ ہو.....!

تنہائی بظاہر ایک کربناک کیفیت کا نام ہے لیکن جب تک انسان کو تنہائی کا احساس نہ ہو وہ اپنے آپ کو ڈھونڈھ نہیں پاتا، تنہائی میں اتنی فرصت مل جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو نہ صرف پہچان پاتا ہے بلکہ خود سے باقاعدہ متعارف بھی ہوتا ہے اور متاثر بھی !!!

جو اپنے آپ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائے سمجھو کہ اُس نے مقصدِ حیات کو پالیا، اپنی پہچان کی منزل پہ پہنچ سکنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ چند ہی خوش نصیب لوگ ایسے ہوتے ہیں جو خود کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، خود فراموشی کے آسیب سے نجات پا جانا بہت بڑی خوش نصیبی ہے۔

مقدر کو تسلیم کرنا زندگی کے مثبت پہلو کی دلیل ہے لیکن اپنی ذات سے بیگانے پن میں زندگی کا منفی پہلو ہی پوشیدہ نہیں بلکہ "خود فریبی" کے جرم کا ارتکاب ہے۔

کائنات کی وسعتوں اور رفعتوں میں گم ہونا یقیناً انسانی فطرت ہے لیکن دل میں کھٹکتے رہنے والے نکیلے جذبے، تعبیر سے محروم خوابوں کی تعمیر، اینٹوں کی طرح لگنے والے پرائے لوگ اور غیروں کی طرح یہ کچھ اپنے رشتے اور وقت کے بکھراؤ میں آرزوؤں کے گھر کی تلاش میں زندگی ضائع ہو جاتی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ سب کچھ اپنی ذات میں ہے .... سبھی کچھ ......!!!

گردشِ دوراں کے آگے جھکنے کے بجائے گردشِ دوراں سے ٹکرانا زیادہ بہتر ہے کہ رازِ خودی اسی میں پنہاں ہے۔ ہمارے وجود کا اظہار تو قدرتی طور پر ہوتا ہے جس کو دنیا تسلیم بھی کرتی ہے مگر ذات کے اقرار کا موقع فراہم نہیں ہونے دیتی۔

انسان دوسرے کی نفی بہ آسانی کر لیتا ہے لیکن اپنی ذات کی نفی ہرگز نہیں کرتا۔

زندگی میں کبھی کبھی کچھ لوگ ایسے بھی مل جاتے ہیں جن پر خود اپنا گماں ہوتا ہے لیکن یہ صرف اتفاق ہوتا ہے صرف اتفاق ______

واقعہ میں اور اتفاق میں نہ صرف فاصلہ ہے بلکہ تضاد بھی ______

جس طرح لفظ جملوں کی تکمیل کرتے ہیں مگر احساس کی ترجمانی نہیں کر سکتے اُسی طرح "گریز اور لحاظ" کی کشاکش میں ہم بھی اپنی ذات سے انصاف نہیں کر پاتے۔

میرا نظریہ یہی ہے کہ "کوشش" اور "تلاش" میں ہم اپنی عمر ضائع کرتے ہیں ہم اپنے آپ سے قریب تر ہوتے ہوئے بھی ان طویل فاصلوں کا سفر کرتے ہیں جو

ہم سے ہماری ذات کو اور بھی دور کر دیتا ہے ـــــــ

"اب کے برس"، "آس پاس"، "امانت"، "دلاسا"، اور "خوشبو کے غزل"، قارئین کی خدمت میں پیش کر چکی ہوں۔ اب مختصر سا تجرباتی ناولٹ "وہ" پیش خدمت ہے۔ ـــــ اور بھی کچھ تصانیف بہت جلد قارئین کی خدمت میں پیش کروں گی، انشاء اللہ تعالیٰ

فاطمہ تاج

۲؍اگست ۱۹۹۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"وہ"

نہ جانے "وہ" کہاں سے آیا تھا، کہاں کا رہنے والا تھا، ہر روز
صبح اسی چوراہے پر میں اُسے کھڑا دیکھتی رہی، کافی عرصہ گزر گیا۔
بہت ہی وضعدار شخصیت کا مالک تھا "وہ"، اُس کا قد بہت اونچا
تھا۔ چہرے کے نقوش بتلاتے تھے کہ اس کا تعلق کسی اعلیٰ خاندان سے ہے۔
چہرے پر دانشورانہ تاثرات نمایاں تھے، بے حد نفیس انداز میں سوٹ پہنے وہ
ہاتھ میں سگریٹ لئے دھوئیں کے مرغولے اُڑاتا رہتا۔
مفکّروں جیسا اُس کا یہ بے نیازانہ انداز مجھے بے حد متاثر کرتا رہا۔
اُس کا اس چوراہے کے پاس پابندی سے ٹھہرنا میرے لئے باعثِ تشویش تھا۔
میرے شوہر ایک کامیاب وکیل تھے۔ اُن کا اکثر اضلاع میں جانا آنا رہتا، شادی
کے ابتدائی دور سے ہی میں تنہائی کی عادی ہو گئی۔ وکیل صاحب کے اور میرے
مزاج میں ذرا بھی یکسانیت نہیں تھی۔ پہلے ہی سال میں طلاق ہو گئی اب میں نے
طے کر لیا کہ دوسری شادی ہرگز نہ کروں گی۔ ہم مزاج شوہر سب کو ملتے نہیں ایک

تجربہ بہت ہے۔ دل نے جب بھی سرکشی کرنی چاہی میں نے ضبط کی زنجیریں اور بھی کس دیں۔۔۔ میں صبح ناشتے کے فوراً بعد اسکول چلی جایا کرتی جو میری ایک دوست فرحانہ کا تھا وہ شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد بیوہ ہوگئی تھی۔

اسکول کے بچے ہی اس کے بچے تھے۔

وہ مستقل مریضہ تھی۔

اسکول کی ذمہ داریوں میں اس کا ہاتھ بٹانے میں وہاں بلاناغہ جایا کرتی، میرا وقت گزر ہی جاتا۔ کئی ماہ یونہی گزر گئے۔ میں جب اُس چوراہے کے قریب ہوتی تو کار کی رفتار دھیمی کر دیتی تاکہ اُس کو دیکھ سکوں، اُس کی سنجیدگی کی تہہ میں چھپے ہوئے وہ راز ڈھونڈ سکوں جو اُس کی شخصیت کو محصور کئے ہوئے ہیں۔ میں نے کبھی اُس کو کسی سے بات کرتے نہیں دیکھا۔۔۔۔۔

اور آخر ایک دن میں نے اپنی کار اُس کے بالکل سامنے روک دی !!!

ہلو! جناب! کیا آپ کسی کے منتظر ہیں؟ میں نے پہلے ہی سوال میں بے تکلفی سے کام لیا۔

کون اس قابل ہے جس کا میں انتظار کروں؟ کھوئے ہوئے سے لہجے میں ایک سنجیدہ جواب مِلا، لہجہ میں بلا کی سنجیدگی اور لفظوں میں بے انتہا حقارت۔۔۔۔

میں ششدر رہ گئی۔

یہ جواب بلاشبہ کئی سوالیہ نشانوں کے نیچے دبا ہوا تھا، آواز میں

الجھی تھا اور کرب کی پرچھائیاں بھی۔

میں نے راز کے غار کا دہانہ کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میں! میں کوشش کروں گی کہ آپ کے قابل بن سکوں.... بے اختیار

ے منہ سے یہ جملہ نکل گیا۔

نے کبھی مخالف ہواؤں سے ہار نہیں مانی تھی، آج ایک اجنبی کے تحقیر آمیز لہجے کے

ر سے زخمی ہو گئی ــــ اُس کے چہرے پر طمانیت نظر آئی اور ہلکی سی مسکراہٹ بھی۔

... میری جرأت بڑھ گئی، میں نے اپنا ساتھ والی سیٹ کے بازو والا کار کا

کھول دیا، ــ

آئیے! ہم تھوڑی دور ساتھ چلیں! وہ کسی سعادتمند بچے کی طرح میری

ر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

میں نے قریب سے اُس کو دیکھا، کافی وجیہہ شخصیت تھی اُس کی، اُس

باس اعلیٰ ذوق کا مظہر تھا۔

میں نے کار کا رُخ شہر کے مضافاتی علاقے کی طرف موڑ دیا، صبح کے دس

تھے۔ نرم دھوپ چمک رہی تھی۔ میں نے کار شہر سے دور جانے والی سڑک پر موڑ

دی۔ یہاں کبھی میرے بڑے بھائی رہا کرتے تھے، اب وہ دنیا میں نہیں ہیں لیکن اس سڑک پر لگتا ہے کہ اب بھی اُن کی آنکھیں دعا بن کر میری نگرانی کر رہی ہوں۔

میری سیدھی جانب چھوٹا سا تالاب اور بائیں جانب بے ترتیب بکھرے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں پھیلی ہوئی سرسبز وادیوں کی خاموش سرگوشیاں مجھ سے سوال کر رہی تھیں۔ یہ کون ہے؟ جسے تم اپنے ساتھ لے آئی ہو، یہاں اتنی دور۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔ کون ہے یہ۔۔۔؟ میں نے اُس پر نظر دوڑائی، اُس کی لمبی زلفیں ہوا سے بکھر گئی تھیں لیکن گیسوئے خمدار کے بکھرنے میں بھی سلیقہ سا لگتا ہے۔۔۔۔۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا میں نے کار کو اک دم سے بریک لگائے، کار کے جھٹکے سے وہ میری طرف مڑ کر کہنے لگا۔

تم گاڑی دیکھ کر چلایا کرو ورنہ حادثہ ہونے کا ڈر ہے۔۔۔

نصیحت آمیز جملے اور تخاطب کے بے تکلف انداز نے مجھے تسلّی دی۔ اُس کی آواز کی گہرائی بلا شبہ چونکا دینے والی تھی۔

میں نے پھر سے گاڑی اسٹارٹ کی اور کچھ آگے جا کر چڑھائی پر روک دی، دھوپ میں تیزی آگئی تھی۔ جنگلی درختوں اور بیلوں پر کھلے کاسنی اور زرد پھولوں پر منڈلاتی تتلیاں بہت اونچی اُڑنے لگیں، ببول کے درختوں پر کانٹے تمام تر شادابیوں کے ساتھ کسی دامن کے منتظر تھے۔ میں ہمیشہ سے ہی دامن سمیٹے رہنے کی عادی رہی ہوں

دامن کو پھیلا کر تار تار ہونے کا موقع میں نے کبھی آنے ہی نہیں دیا، ہم بڑے بڑے پہاڑ جیسے پتھروں کے پاس بیٹھ گئے۔

اُس کے سگریٹ کا دھواں پھیلنے لگا اور گہرائی ہوئی فضا میں میں نے ہی گفتگو کا آغاز کیا۔

آپ کہاں رہتے ہیں؟

تمھارے اسی شہر میں!

جواب کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے کہ میں رئیسِ شہر ہو گئی ہوں —

اُس کے مُنہ سے مجھے "تم" کا لفظ بہت پسند آیا، جو صرف میرے لئے تھا صرف میرے لئے، میرے ہی لئے....... اور مجھے یہ "تم" میری محرومیوں کی نفی کرتا محسوس ہوا۔ مجھے لگا جیسے ساری کائنات "تم" کے لفظ میں سمٹ آئی ہو!

ہم پہ چھائی ہوئی خاموشی کی دبیز تہہ کی طرح بادل چھانے لگے، کھورے بادلوں نے سورج کو صندلی قبا میں چھپا لیا۔ موسم خوشگوار تھا، ہرے بھرے جنگل کی ٹھنڈی اور خوشبودار ہواؤں نے اُکسایا کہ کچھ شاعری کی جائے، میں نے اُس سے پوچھا

کیا آپ کو شاعری پسند ہے —؟

کیا کسی کو شاعری ناپسند بھی ہوتی ہے؟ اُس کا جواب خود سوال تھا۔

میں نے کہا، ہاں! کچھ لوگ اسے بکواس کہتے ہیں۔

وہ بڑبڑایا، بکواس کرتے ہیں وہ لوگ......

میں نے اُس سے کچھ اچھے شعر سنانے کی فرمائش کی تو اُس نے کہا "تم سناؤ، دیکھوں تو تمہارا ذوق کیسا ہے؟" پھر وہی سوال....

زندگی یوں نہ تجھے چھوڑ کے جانا تھا

اک نظر دیکھ لے میں بھی ترا ہمسایہ ہوں

اُس نے پوچھا، کس کا ہے یہ شعر!

میں نے کہا، شاعر کا نام نہیں معلوم، لیکن آپ بتلائیے آپ کو کیسا لگا یہ شعر؟

شاعر نے زندگی سے التماس کیا ہے جب کہ زندگی کی سچائی یہ ہے کہ وہ فریاد نہیں جرأت چاہتی ہے۔ اپنے وجود میں جذب ہونے والی تنہائی پل پل زندگی کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ زندگی سانسوں کے تسلسل کے باوجود بھی غمِ دوراں میں کہیں نہ کہیں کھو ہی جاتی ہے۔ اُسے ڈھونڈنا فطرت کا تقاضہ اور پالینا مقدر.........

اُس کے آخری جملہ میں اُداسی کی پرچھائیاں واضح تھیں.....!

میں دل ہی دل میں خوش ہو گئی کہ کتنے اچھے اور سچے خیالات ہیں اس کے، مجھ سے اِس طرح کی گفتگو کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ایک فرحانہ تھی لیکن اُس

س لفظ کم اور آنسو زیادہ تھے ۔۔۔۔۔۔

میں نے اسے ایک اور شعر سنایا ؎

ہم عمر بھر سمجھتے رہے جن کو خوشگوار

لمحے وہی ہیں عارضۂ دل بنے ہوئے

شعر کے بارے میں کیا خیال ہے ۔؟ میں نے پوچھا ۔
نے کہا ' خوشگوار لمحے زندگی دیتے ہیں ' وہ لمحے کبھی عارضۂ دل نہیں
مگر خوشگوار لمحے ہوتے کہاں ہیں ۔؟ مجھے میں بڑی حسرت تھی ۔
ے اُس سے خواہش کی کہ وہ بھی کچھ شعر سنائے ۔

اُس نے پوچھا کس کا شعر ۔۔۔؟

میں بوکھلا گئی ۔۔۔ کسی کا بھی ۔۔۔۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کے
ے میں بخوبی واقف تھی ۔ ؎

سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح

دیکھو تو اک شکن بھی نہیں ہے لباس میں

ڈ کیسا لگا یہ شعر تمہیں ۔۔۔۔۔۔ آواز میں ہلکی سی لرزش بھی تھی ۔
ں سلوٹیں میرے اندر موجود تھیں اور اُس کا لباس ؟ میں نے دیکھا
ایک شکن بھی اُس کے لباس پر نہیں تھی میں اُس کا جواب دینے کے

بجائے سوچ میں غرق ہوگئی۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کی روح بھی میری طرح سلوٹوں سے بھری ہوئی ہے ؟

شاید اُس نے کچھ کہا تھا مجھے اُس کی آواز محسوس ہوئی لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آسکے۔ اُس کی کہانی جاننے کے لئے میں بے چین ہوگئی مگر یہ پہلی ملاقات تھی۔

بھورے بادلوں کی قبا سے سورج نکل آیا، چمکدار، بہت ہی تیز کرنیں خنجر کی طرح جسم پہ لگنے لگیں - دھوپ کی تپش نے ماحول کو گرما دیا تھا۔ اُس نے پھر ایک سگریٹ سلگا لیا، دھوپ کا منظر قریب سے کہُر کا منظر بنا جارہا تھا۔ —— میں نے واپس چلنے کے لئے پوچھا تو وہ حکم کی تعمیل میں اُٹھ گیا۔ —— اور اس طرح ہم وہاں سے لوٹ آئے راستے میں اُس نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا " بہت اچھی جگہ کا انتخاب کیا تم نے . . . . .

شہر کا شور، ہنگامہ، کچھ بھی نہیں، بڑے پُرسکون ماحول کو پسند کرتی ہو تم !

جو لوگ زیادہ مضطرب ہوتے ہیں وہ ایسے ہی ماحول کو پسند کرتے ہیں . . . . .

میں نے مسکراہٹ کی چادر تان لی۔ ——

اس "تم" پر بھی چاہا کہ گولڈ میڈل جیت کر آنے والی کسی ٹیم کی طرح میں قہقہے لگاؤں، اُچھل کود مچاؤں یا پھر۔۔۔ یا پھر اپنے تکیے میں منہ چھپا کر لوٹ جاؤں لیکن میں ایسا کچھ بھی نہ کر سکی۔

اسے اُسی جگہ سے پر اُترنا تھا، اس نے مجھے نہیں بتایا کہ وہ کس جگہ جانا چاہتا ہے شاید کوئی ایسے راستے پر جو کسی دشواری کے بغیر منزل تک پہنچا دے۔

اور یہ ملاقاتیں روز کا معمول ہو گئیں۔

اُس کے منہ سے "تم" زیادہ ہی نکلنے لگا تھا اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے کسی طرح کا مجھ پر رعب جمانے یا کسی ڈھکے چھپے جذبے کا اظہار کرنے کی کوشش کی ہو۔ وہ بہت سنجیدہ انسان تھا اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ مجھ سے ہمکلام رہتا۔

میں نے فرحانہ کے اسکول کو جانا بھی کم کر دیا تھا۔ فرحانہ نے پوچھا تو میں نے کچھ ذاتی مصروفیات کا بہانہ بنا دیا۔

میں نے دوسری شادی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ پہلی شادی کی ناکامی کے بعد میں بے حد چوکنا ہو گئی تھی۔ امی، ابو کی خواہش کو مسلسل نظر انداز کرتے ہوئے برسوں گزار دیے یہاں تک کہ امی، ابو دنیا

سے چل بسے۔ بھائی جان تجسس کا شکار تھے۔ صوفیانہ زندگی اختیار کرتے ہوئے شہر سے دور جنگل میں چلے گئے اور وہیں دنیا سے رخصت ہوئے۔ ابو کی چھوڑی ہوئی یہ چھوٹی حویلی اور مختلف کمپنیوں میں لگایا ہوا معقول سرمایہ، میری گزر بسر ٹھاٹ سے ہوتی رہی۔

اُسی سڑک پر میری فیٹ کار 1550 دوڑتی رہی جہاں مرحوم بھائی جان کی روحانی محافظ آنکھیں مسلسل میری نگراں تھیں۔ اور میں اپنے ماضی کو ذہن کے گوشے میں محفوظ رکھتے ہوئے گزرتی رہی۔ اُس کے وجود میں جیسے میری ذات کہیں کھونے لگی تھی۔

پکی سڑک سے کچی سڑک اور پھر جنگل کے نشیب و فراز، بدلتے موسم، دھوپ چھاؤں کی لمحاتی تبدیلیاں، ملاقات کے عارضی لمحے، مستقل احساسات، ساتھ گزارنے والے وقت کی طوالت میں اضافہ ہوتا گیا۔

ایک دن مجھے کچھ دیر ہو گئی۔

میری گاڑی اُس کے آگے رُکی تو وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

تم نے آج بہت دیر کر دی، بہت ہی دیر کر دی!

ٹھہرے ہوئے پانی میں اضطراب کے کئی کنکر جیسے کسی نے پھینک دیئے ہوں، اور مجھے یہ لہریں کسی طوفان کا پیش خیمہ لگیں..... اندیشوں کے کچھ حباب

کے ساحل پہ اُبھرے ...... اور پھر خود ہی پھوٹ گئے ....!

دلچسپ گفتگو ہوتی تھی اُس کی وہ بڑے عجیب سے سوال کرتے ہوئے

گہری نظروں سے دیکھتا تو میں سٹپٹا کر رہ جاتی۔

اُس کی آنکھوں میں اُن سوالوں کے تمام جواب موجود ہوتے جو میرے

ین "طائر بے پر" کی طرح تڑپتے رہتے ......!

اکثر اُس کا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں ہوتا اور دوسرے ہاتھ میں

یٹ رہتا جس کے کش لیتے وقت اُس کے چہرے کی سنجیدگی بلا کی متاثر کن

رتی ــــ کشادہ پیشانی پر فکر کی لکیریں مرعوب کر جاتیں۔

کبھی تلخیٔ دوراں میں ڈوبی اُس کی طنزیہ مسکراہٹ مجھے زندگی کے

ب و فراز سمجھاتی محسوس ہوتی ــ میں اس خوابوں کی دنیا سے بالکل نہیں

چاہتی تھی جہاں صرف "وہ" اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر دانشورانہ

وکے مستقل تجربات سے گزرتے رہتے۔

ہم سچائیوں کے گرداب میں ڈوب کر تہہ تک جاتے اور پھر ساحل پہ

اُبھرتے۔

"وہ" بہت شائستہ مزاج انسان تھا۔

"وہ" میرے خوابوں میں ہمیشہ میرا منتظر رہتا جیسے کہ میں اُس سے

ملنے کے لئے بے چین رہتی ۔ وہ میرے خوابوں میں اپنی رعب دار شخصیت سے لیے نیاز بہت سنجیدہ اور سُلجھی ہوئی گفتگو سے حیاتِ خوابیدہ کے در دجگا دیا کرتا۔ گونجتی آواز، ٹھہرا ہوا لہجہ، شائستہ لفظوں کی گرفت سے میں آزاد ہونا ہی نہیں چاہتی تھی۔

میں کبھی اُس کے کوٹ کے کالر پہ کوئی ننھا سا پھول لگا دیتی تو وہ پھول کی طرح مسکرا دیتا۔ وہ ہمیشہ سوٹ میں ملبوس زمانے بھر کی نگاہوں کا مرکز بنا رہتا۔

آسمان بادلوں سے گھرا ہوا، رہ رہ کے بجلی بے قرار دل کی طرح تڑپ اُٹھتی، شاید بارش ہو مگر ...... کسی کو پرواہ ہے اس بارش کی، اس بجلی کی؟

مجھے تو بہر حال جانا ہے، وہ بھی تو میرے انتظار میں ہوگا .....

میں نے بنجارہ کام کی ہوئی سبز ساڑی پہنی تھی۔ موسم کی طرح سرسبز و شاداب بنی میں اپنی گاڑی تیز رفتاری سے اُس کی طرف لئے جا رہی تھی۔ ۔۔۔ پُل پر سے گزرتے وقت یوں لگا جیسے یہ پُل ہم دونوں کو ملانے کے لئے ہی بنا ہو ۔۔۔

دونوں طرف یہاں کافی ہجوم رہتا، کھلونوں کی دوکانیں قطار در قطار تھیں۔ گاڑی مشکل سے گزرتی مگر کٹھن لمحوں کی طرح گزر ہی جاتی۔

میں نے دیکھا وہ بھی آسمان کی طرف شاکی انداز میں دیکھ رہا تھا جیسے

کہ اُسے بھی بارش کی وجہ سے میرے نہ آنے کا اندیشہ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ !

میری گاڑی پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر صاف دکھائی دی ۔ اُس نے اظہار تو نہیں کیا لیکن مجھے محسوس ہو چلا تھا کہ وہ میرے انتظار میں بہت بے چین رہا ہے ۔ ہر لمحہ اُس کے لئے یقیناً صدی کی طرح گزرا ہوگا

جلدی سے وہ کار کا پٹ کھول کر سیٹ پر بیٹھ گیا ، حسبِ معمول اُسی راستے پر گاڑی دوڑتی رہی ۔ اور معمول کے مطابق اُسی چڑھائی پر رک گئی ۔

آپ سگریٹ بہت پیتے ہیں ، کیوں ؟

کیا تمہیں پسند نہیں ؟

میں چونکی ضرور لیکن بات کا رُخ بدلتے ہوئے فوراً کہا

اگر بارش ہو جائے تو ۔ ؟

کیا تم بھیگنے سے ڈرتی ہو ۔ ؟

جواب میں میرے پاس ہلکی سی مسکراہٹ اور خاموشی ہی تھی ۔

بہت دیر تک ہم چپ چاپ بیٹھے رہے ، خاموشی بولتی رہی ۔

سوالوں کا سمندر میرے اندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا ، اُس کی سوال کرنے والی فطرت نے جیسے میرے مُنہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کچھ دیر بعد ہمارے درمیان موسم کا ذکر چل نکلا ۔

کتنے موسم ہوتے ہیں انسان کی زندگی میں ۔۔؟ میں نے سوچا شائد میرا سوال اُسے لاجواب کر دے ۔۔۔ اُس نے زوردار کش لیتے ہوئے کہا، صرف ایک ہی موسم ہوتا ہے انسان کی زندگی میں ۔۔۔ تڑپنے کا موسم ! ۔۔۔ انسان کبھی انتہائی خوشی سے بھی تڑپ اُٹھتا ہے اور ۔۔۔۔۔ کبھی رنج و غم کی شدت سے ۔۔۔۔

تڑپنے کا موسم بہار و خزاں سے عبارت نہیں، زندگی کی علامت ہے، آواز کی گمبھیرتا نے ڈیرا ڈال دیا ۔۔۔۔۔۔

کوئی ایسا لفظ کہیئے جو اس موسم کی گفتگو کی وضاحت کر سکے ۔۔۔۔

میں خوامخواہ بات بڑھانے لگی، ترجمہ لفظوں کا ہوتا ہے، احساس کا نہیں ۔۔!

وہ اپنے فلسفے میں ڈوبا ہوا تھا۔

احساس کی ترجمانی لفظ ہی تو کرتے ہیں! میں شائد اُس کے قابل بننے کی کوشش میں لگی تھی۔ زبان لڑکھڑانے سے لفظ پھسل جاتے ہیں، احساس کہیں نہیں کھوتا ۔۔۔۔۔۔۔

بوندا باندی شروع ہو چکی تھی، ہم واپس ہو گئے ۔۔۔

آج!

آج تو موسلا دھار بارش میرا راستہ روکنے پر تُلی ہوئی ہے، بھلا

یہ بارش بھی روک سکتی ہے ۔؟؟

قوسِ قزح جیسی ساڑی موسم کے حساب سے بہت موزوں لگ رہی
تھی ۔ میں نے چھتری بھی احتیاطاً ساتھ لے لی ۔

سڑکوں پر پانی ٹھہرا ہوا تھا اور بارش مسلسل ہو رہی تھی ۔ میں نے
اس چوراہے کے پاس اپنی کار روک دی جہاں وہ ایک دوکان کے کونے
پر چھتری لئے ٹھہرا ہوا تھا ، کتنا بھروسہ تھا اُس کو مجھ پر ، کتنا یقین
تھا اُسے کہ اس طوفانی بارش میں بھی میں اُس سے ملنے ضرور آؤں گی ۔

اور پھر ہم اُسی مضافاتی علاقے کی طرف چل پڑے ، جہاں
درخت پودے ، بیلیں ، پہاڑ ، وادیاں یعنی قدرتی مناظر ہمارے منتظر
تھے ۔۔۔۔۔ میں نے گاڑی روک دی ۔

پہاڑوں پر سے بارش کا پانی آبشار کی طرح گر رہا تھا ۔ ہم گاڑی
سے نکل آئے ، اپنی اپنی چھتری سنبھالی ۔ ہم ایک گھنے درخت کے نیچے
ٹھہر گئے ۔ مٹی ، پانی کی ملی جلی خوشبو روح تک اُتر گئی ۔

بارش کا موسم بھی کتنا عجیب ہے ، دیکھتے ہی دیکھتے ننھی ننھی
بوندیں تیز دھاروں میں بدل جاتی ہیں ۔ ہوا کا بھیگا دامن چہرے کو تازگی
دیتا ہے ۔ اُس نے میرے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا ، میں نے

جھلا کر کہا ـــــ

آپ چپ کی تازگی کی بات کرتے ہیں ۔ سچ تو یہ ہے سارا ماحول

نکھر آیا ہے ۔

ایسے میں کیا کرنا چاہیئے ـــ ؟ اس کی سوالیہ فطرت زوال پذیر کیسے

ہوتی ـــ ؟ ــــ میں نے کہا ـــ

قدرت کے مناظر انسان کے وجود کی عظمتوں کے اقرار کے لئے

بنائے گئے ہیں ، یہ چاند ، یہ سورج ، یہ تارے ان کی روشنی اور حرارت

انسانی حیات کی بقا کے لئے ہی تو ہے ۔ ۔ ۔ انسان واقعی کتنا عظیم المرتبت

ہے ۔ ۔ ۔ ۔ میں روانی میں کہہ رہی تھی ۔

بالکل تمھاری طرح ! وہ بڑبڑایا ۔

میں چونک پڑی ، کیا کہا آپ نے ؟

کچھ نہیں ! وہ کھوئے ہوئے لہجے کی سرگوشی شاید میرا تخیل ہی تھا ۔

تم نے زندگی کے بارے میں کبھی سوچا ہے ۔ ؟

یعنی ۔ ۔ ۔ ۔ میں سراپا حیرت تھی ۔

یہی کہ زندگی تمھاری نظر میں کیا ہے ؟ زندگی اتفاق ہے

یا حادثہ ــــ ؟

آپ مجھ سے یہ سوال کر رہے ہیں؟

ہاں! کیونکہ تم بھی تو میری طرح سوچتی ہو، تمہارے احساسات بھی شدید ہیں، ایسے لوگ زندگی کو ہر زاویئے سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں ——

میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا، وہ غور سے میرے ہنستے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا — اس سے پہلے کہ میں دوسرا سوال کروں تم پہلے سوال کا جواب نہیں دوگی کیا —؟

میں تو گردشِ دوراں کا بھی جواب دے سکتی ہوں اور دیا بھی ہے آپ کے سوالوں کے جواب بھی میرے لئے مشکل نہیں اور پھر اس نظریاتی پہلو سے میں کچھ زیادہ ہی مانوس ہوں سنیئے! زندگی میری نظر میں نہ اتفاق ہے نہ حادثہ، زندگی میری نظر میں ایک آرزو ہے جس کی تکمیل میں ہم روزِ ازل سے لگے ہیں، تکمیلِ آرزو ہو یا نہ ہو لیکن انسان آخری سانسوں تک آرزو کی تکمیل میں ہی لگا رہتا ہے۔ ریت کی دیوار اٹھانے کی کوشش میں عمر تمام ہونے لگتی ہے لیکن آرزو کی دائمی صفت تکمیل طلب ہے اور ہم کسی معمار کی طرح آرزوئے حیات کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔ کبھی گھڑی بھر کے لئے کامیاب ہو بھی جاتے ہیں اور یہی ساعتِ حیات ہماری آرزو کا حاصل ہوتی ہے۔ میں ایک بے باک مقررہ کی طرح بولے جا رہی تھی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ

اُس کی نظریں میرے چہرے پر اس طرح جمی ہیں جیسے کوئی پجاری، دیوی کی طرف عقیدتمندانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اُس کے دیپک روشن کر رہا ہو۔
میں خاموش ہو گئی ــــ

ہوا کا تیز جھونکا ہمارے درمیان سے گزر گیا۔۔۔۔ اُس کی زلفوں کو بکھیرتا ہوا، میرے آنچل کو کھینچنے کی ناکام کوشش کرتا ہوا۔۔۔۔۔۔
بارش تھم گئی تھی۔ میں گاڑی سے کافی کا تھرماس اور کچھ سنیکس نکال لائی۔ ہلکے سے ناشتے کے بعد مزید گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب کے آغاز میں نے ہی کیا تھا۔

یہ بتائیے آپ زندگی کو کس طرح محسوس کرتے ہیں ــ؟

اُس کی سوالیہ نظرت مجھ میں سرایت کر گئی تھی، میں اُسی کے انداز میں پوچھ بیٹھی ــــ اُس نے ہاتھ کا ادھ جلا سگریٹ پھینک کر نیا سگریٹ سُلگا لیا۔ لائٹر سے نکلتے شعلے کی گرمی مجھے اپنے چہرے پہ محسوس ہوئی۔ ــ دھویں کے دائرے میرے آس پاس پھیلنے لگے لیکن دھوئیں کے یہ دائرے حلقۂ زنجیر تو نہ تھے جو مجھے قید کرتے، میں نے اپنے آنچل سے دھوئیں کے دائروں کو فضا میں تحلیل کرتے ہوئے سوال دہرایا۔

بتائیے نا، آپ کا زندگی کے بارے میں کیا نظریہ ہے ــ؟

تم آج زندگی کے پیچھے کیوں پڑی ہو؟ ایک نیا سوال ......
آپ ہی نے موضوعِ گفتگو "زندگی" منتخب کیا ہے۔ کیا میرے سوال کا جواب
آپ کے لئے مشکل ہے؟ میں اُسی کی طرح ہوتی جارہی تھی۔
وہ مُسکرا دیا جیسے کسی بچے نے اُس سے کوئی معصوم سی فرمائش کی ہو۔!
یہی طرح کسی کو ڈھونڈنا مشکل ہے، مگر جب میرے لئے یہ بھی آسان ہوگیا تو
تمہارے سوال کا جواب کیسے مشکل ہوگا میرے لئے ۔ ۔ ۔ ؟
میں نے زندگی کو صرف ایک "حرف" سمجھا ہے جسے ہم مٹنے دینا نہیں
چاہتے، تحریرِ زندگانی جب دھندلانے لگتی ہے تو ہم اسے گہرا کرنے کی کوشش
میں لگ جاتے ہیں پانی کے بنے نقش پانی میں تحلیل ہوجاتے ہیں۔ پتھر پہ
بنے نقش تاریخ بن جاتے ہیں لیکن زندگی کے تمام نقوش دھندلانے والے
ہوتے ہیں۔ ان کا دھندلاپن دور کرنے کی جدوجہد کرتے کرتے ہی وہ شام
آجاتی ہے جہاں ہماری آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کہ زندگی تمہاری طرح کے وجود میں ڈھل جاتی ہے۔ ایک مجسم پیکر بنی مجھ سے
ہمکلام بھی ہوتی ہے، سوال بھی کرتی ہے، جواب بھی دیتی ہے۔ زندگی کی
ایسی مکمل ساعت کسی کسی کی زندگی میں کبھی آہی جاتی ہے۔ ہر شخص ان ساعتوں
سے نہیں گزر سکتا، ہر ایک کو تلاش کا حاصل نہیں ملتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہ نہ جانے اور کیا کیا کہتا رہا، میرے کانوں میں صرف ہوا کی سرسراہٹ تھی دل کی دھڑکن ایک خوشی سے بھرپور تاثر کے اظہار کے لئے بے چین بن کر ہونٹوں تک آنے کو بے قرار تھی۔۔۔۔ مگر میری انا کا ساغر بہت گہرا تھا، ضبط کے پیمانے کو میں نے کبھی چھلکنے نہیں دیا۔

میں چھوٹے سے پتھر پر چٹان کی طرح اس کے سامنے بیٹھی رہی اور وہ طوفان بپا کرنے والے جملوں کے پتھر میری ذات کی ساکت و جامد جھیل میں پھینکتا رہا ــــــــ

شفق کا رنگ آسمان سے اب زمین پر پھیلنے لگا سنہری شعاعوں کا عکس چہرے پر پڑنے سے وہ کسی سُرخ اور چمکدار دھات کا مجسمہ لگ رہا تھا، ذرا دیر کے لئے جی چاہا اس دھات کے مجسمے کو اپنی فنکارانہ صلاحیت سے کیوں نہ مٹی کا بنا لوں۔۔۔۔؟

مگر یہ خواہش صرف سوچ تک محدود تھی۔ عملاً ایسا ہو نہیں سکتا تھا۔

اور اس صداقت کو تسلیم کرتے ہوئے میں دل ہی دل میں مطمئن ہو گئی۔

سنہری رنگ میں سُرخی آ گئی، سُرخیِ شفق نے سبز جنگل پر اپنا دامن پھیلا دیا۔ لمحہ بھر میں سُرخی میں گہرائیں شامل ہو کر اندھیرے کی شکل اختیار کرنے لگا، لیکن میں نے اپنی باتوں کا سلسلہ ختم نہیں کیا۔

آپ نے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا بتائیے نا ۔ ؟
آج تجسس کے کاروان سے جرس کی صدا گونج اُٹھی ۔
میں نے فاصلے کا تعین کرتے ہوئے پُراسرار شخصیت کے ساتھ سفر
کا آغاز کیا ۔

گہری خاموشی میں کچھ دیر اُداسی بھی شامل رہی پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر
مضطرب دل کے تار جھنجھنا اُٹھے ۔ وہ بالکل میری ہم خیال تھی ۔ خوش شکل
ہی نہیں خوش اطوار بھی تھی ۔ میں نے اُسے جی جان سے چاہا ۔ وہ کالج میں ساتھ
ہی پڑھا کرتی ۔ جب میں نے ماں پر اپنی شادی کا خیال ظاہر کرتے ہوئے اُس
کا نام لیا تو وہ بپھر گئیں ، کیا ۔ ؟ ایک کلرک کی بیٹی سے شادی کروگے ؟ کیا
وہ تمہارے قابل ہے ؟ وہ تو تم سے بات کرنے کے بھی لائق نہیں ۔ ۔ ۔ ۔

ماں کا سکّہ سارے خاندان میں چلتا تھا ۔ زمین آسمان بدل
سکتے تھے مگر ان کا فیصلہ نہیں بدل سکتا تھا ۔ میں جرأت مندانہ اقدام
نہ کر سکا ، اس میں اُس کی رسوائی ہو جاتی ، غریب کی دولت تو اُس کی عزت ہی
ہوتی ہے ۔ میں جاگیردار گھرانے کا چشم و چراغ ہو کر بھی اپنا شہر چھوڑ آیا
اور تنہائی کی ردا اوڑھ لی ۔ ناکامیٔ محبت کے غم کو عمر بھر کے لئے گلے لگا لیا کچھ
ہی عرصہ بعد معلوم ہوا کہ وہ بس کے حادثہ کا شکار ہو گئی ۔ میں راتوں کو جاگتا

رہا۔ کبھی نیند آتی تو خواب میں دیکھتا کہ وہ کسی گاڑی کے نیچے دب گئی ہے اور اس کا خون دور تک بہتا جا رہا ہے۔۔۔۔۔ (اُس نے اب بھی اُس کا نام نہیں بتایا)

چند سال بعد ماں کا انتقال ہو گیا، میں وہاں کافی دیر سے پہنچا۔ تقریباً چار دن بعد ـــــ حویلی کرایہ پر اُٹھا دی۔ تمام جائیداد غریبوں، یتیموں کے نام وقف کر دی اور پھر لوٹ آیا۔ میں یہاں ایک چھوٹے سے گھر میں کرایہ دے کر رہتا ہوں۔ ایک ملازم ہے جو میری ضرورتیں پوری کر دیتا ہے۔۔۔۔۔

میں نے اپنے ہاتھ پہ بندھی گھڑی پر یونہی نظر ڈالی مگر وقت نہ دیکھ پائی ماحول بتا رہا تھا کہ دن تمام ہوا شام، رات کا نقاب اوڑھے سامنے کھڑی ہے، ہم بھی کھڑے ہو گئے ـــــ

رات بھیگ چلی تھی، میری پلکوں کی طرح۔۔۔۔

زندگی کے اُسی موڑ پر وہ مجھے کیوں نہ ملا جہاں سے میں نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا ـــ؟

میں نے خود سے سوال کیا، مگر۔۔۔۔۔!

نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

صبح اُٹھی تو آفتابی کرنوں سے نہائی ہوئی فضا نکھار نگاہوں کو دعوتِ نظارہ

دے رہا تھا۔ شاداب درختوں کے پتوں اور پھولوں پر ٹھہری ہوئی بوندیں اس بات کی گواہی دے رہی تھیں کہ زمین سیراب ہو چکی ہے۔ ہوا میں بسی ہوئی خوشبو نے سوگوار کیفیت کو خوش منظری کا لباس پہنا کر طبیعت میں بشاشت کا احساس دلایا۔

..... اور میں اس خوشگوار صبح کے استقبال کے لئے تیار ہو گئی۔

چوراہے کے پاس ایک سفید رنگ کی ماروتی کے پاس وہ بادامی رنگ کے سوٹ میں ملبوس بڑا وجیہہ دشاندار لگ رہا تھا۔ آج اُس کے ساتھ میں کار دیکھ کر حیرت میں پڑ گئی۔

میں نے اپنی گاڑی اُس کی گاڑی کے پاس ہی روک دی، میں نے پوچھا۔

کیا آپ کی کار ہے یہ — ؟

ہاں! تمہیں تعجب کیوں ہو رہا ہے ؟ پھر ایک سوال.....

اُس نے اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا —

چلو آج ہم ایک نئی جگہ چلتے ہیں۔ کل سے تم میری گاڑی میں میری پسندیدہ جگہ چلو گی، ٹھیک ہے ؟

میں نے گردن سے اشارہ کرتے ہوئے حیرانی کو چھپانے کی کوشش کی اور اُس کی ماروتی کار کے پیچھے میری فیٹ کار دوڑتی رہی۔

رہنمائی..... ہمسفری..... خیالوں کی پرواز حدوں کا تعین نہیں کرتی۔

خوابوں کے ساغر تعبیر کی مئے سے بھرے محسوس ہونے لگے۔

ہم شہر سے بہت دور آچکے تھے۔ بڑے خوبصورت مکان نظر آرہے تھے کئی مکان تو پہاڑوں پر بنے تھے، اور کچھ مکان پہاڑوں میں ہی بنے تھے۔ کہیں کہیں تعمیری پتھروں کا ڈھیر بھی نظر آجاتا۔ میں نے اُس کی پسند کی داد، دل ہی دل میں دی اور آخر بہت ہی چڑھائی والے راستے پر ہم پہنچ کر رک گئے۔ یہاں کوئی مکان تھا نہ آبادی کے کچھ نشان، مگر نظر کے سامنے ڈھلان میں پھیلے ہوئے مکان کھلونوں کی طرح بکھرے پڑے تھے، ہم شہر کے شاید سب سے بلند حصّے میں تھے.......

اُس نے بڑے سے گول پتھر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں بیٹھ گئی وہ خود بھی تھوڑے سے فاصلے پر بیٹھ گیا۔

ذہنی قربتیں اپنی جگہ، لیکن فاصلے برقرار تھے ——— !

ہاتھ میں دبے سگریٹ کا ایک لمبا سا کش لے کر اُس نے پوچھا،

موسیقی سے دلچسپی ہے تمہیں ؟

میرے ذہن میں ستار بج اٹھا، کانوں میں شہنائی کی گونج سنائی دینے لگی، کسی راگ جیسی کیفیت رگ و پئے میں سما گئی۔

صرف سُن سکتی ہوں، بجا نہیں سکتی! میں نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

اظہار کر دیا۔
اُس نے مجھ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
یہ جگہ کبھی بنجاروں نے آباد کی تھی اب یہاں بنجارے کم اور رئیس لوگ زیادہ
بس گئے ہیں۔ خاص طور پر نئی تہذیب کے دلدادہ لوگ!
پرندوں کا غول ہمارے اوپر سے شور مچاتا گزر گیا۔۔۔۔
دوپہر کی کرنیں دودھیا بادلوں کے گھونگھٹ میں شرمیلی دلہن کی طرح منہ چھپانے
لگیں۔۔۔۔

ہم لوگ چہل قدمی کے ارادے سے اُٹھ کر آگے بڑھ گئے۔
بارش کے بعد والی فضاء بڑی مسحور کن ہوتی ہے۔ گنگناتے بھنورے
رقص کرتی تتلیاں اور شاداب درختوں کی انگڑائی لیتی ٹہنیاں۔۔۔
ہمارے قدموں کی چاپ سناٹے کو توڑ رہی تھی۔ مکان بہت دور دور تھے
پھر بھی باہر سے نہیں لگتا تھا کہ ان مکانوں میں مکین بھی ہوں گے۔
دنیا میں حسن و عشق کی بے شمار داستانیں ہیں کیا تمہیں نہیں لگتا
کہ ان سب داستانوں میں حقیقت کم اور افسانے زیادہ ہیں۔۔۔؟
اس نے بڑی دیر بعد خاموشی کو توڑا۔
مثلاً۔۔۔؟ میں سوال کو سمجھنے کی کوشش میں تھی۔

یعنی سوہنی، مہیوال، ہیر، رانجھا، وامق، عذرا، قیس و لیلیٰ اور ....
بس بھی کیجئے، ان سب کہانیوں پر فلمیں بن چکی ہیں، کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس موضوع پہ اب ہمارے پاس کہنے کے لئے کچھ بچا کھچا ہے ؟
مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ حُسن تو فنا ہونے والی شئے ہے لیکن عشق کو کہیں زوال نہیں پھر بھی حُسن کا نام لیا جاتا ہے کیوں۔ ؟
اُس نے میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے نیا سوال کر دیا۔
یہ بات میری نظر میں بالکل غلط ہے کہ حُسن فانی ہے، حُسن فنا نہیں ہوتا بلکہ عشق میں جذب ہو جاتا ہے۔ اسی لئے حُسن اور عشق کا نام ساتھ لیا جاتا ہے، میں نے مدلّل جواب دیا .....
اُس کے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے جیسے ..... جیسے مسافر کو بھٹکتے بھٹکتے منزل کا نشان مِل جائے اور پَل بھر میں راستے کا تعیّن ہو جائے ..... جس سے سفر کے دشوار تجربوں کی خلش مٹ جاتی ہے آبلے پھوٹنے کے بجائے دب جاتے ہیں ..... اور مسافر کے اِرادے اُن بگولوں کو پرے دھکیل دیتے ہیں جو نشانِ منزل مٹانے کے لئے حملہ آور ہوتے ہیں۔
میرے بے ساختہ جواب کا اُس پر شدید ردِّ عمل ہوا تھا۔

اُن کے ہاتھ میں سگریٹ جلتا رہا۔۔۔۔ وہ کش لینا بھول گیا تھا شاید۔۔۔۔!

پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھتے رہے اور بہت دیر تک یونہی خاموشی چھائی رہی ۔۔ شاید سوالوں کی "مینا" خالی ہو چکی تھی۔

۔۔ یا پھر ساقی تھک گیا تھا۔۔۔۔

شرمیلی کرنیں بادلوں کا قفس توڑ کر نکل آئیں، دھوپ بڑھ گئی تو ہم نے بھی جانے کا ارادہ کر لیا۔

میں دوسرے دن سہ پہر کے بعد اُسی چوراہے کے پاس گئی جہاں اُس کی کار میرا انتظار کر رہی تھی، میں نے آج اپنی کار کی بجائے گھر سے یہاں تک آٹو رکشا میں سفر کیا تھا اور پھر میں بالکل اُسی طرح اُس کی گاڑی میں آگے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری زلفیں بالکل اُسی طرح ہو گئی ہیں اور میرے ہاتھ میں سگریٹ بھی ہے اور دھواں، دھواں منظر بھی۔۔۔۔۔۔۔

راستہ خاموشی سے طے ہوا، میں اُس وقت چونکی جب وہ بار بار ہارن بجا کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں سرِ بہ فلک خیالوں میں

گم تھی۔

ہارن۔۔۔۔مسلسل ہارن۔۔۔۔اُس کا یہ اندازِ تخاطب بھی

خوب تھا۔

میں مسکرا کر گاڑی سے اُتر آئی۔

دل میں سوچا آج میں نام ضرور پوچھوں گی۔

ذہن نے کہا، ہونہہ! نام سے ہونا کیا ہے؟ ذات سے واسطہ رکھو، ذات

سے، نام صرف تعارف ہے ـــــ

ذہن نے کہا، ذات کا نام بھی ہوتا ہے۔

لیکن ہم وجود سے بندھے ہوتے ہیں، دل مچلا۔۔۔۔۔۔

وہ ایک پتھر پر بیٹھ چکا تھا اور میں سوچ میں غرق آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

اُس نے مجھے اونچی آواز میں مخاطب کیا،

کیا ہوا ہے آخر تم کو؟ کیوں کھوئی ہوئی ہو ـــ؟

میں نے اپنی پشیمانی چھپاتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔

بس، ایسے ہی، ذرا تھکن ہے نا!

چہرے سے تو نہیں لگتا کہ تم تھکی ہوئی ہو، کافی بشاشت ہے چہرے پر،

اُس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے اپنا رُخ پھیر لیا۔ ہوا کا رُخ

اگر چہرے کی طرف ہو تو چہرے کا رُخ بدلنا ضروری ہو جاتا ہے ورنہ آنکھوں میں
دھول پڑ جاتی ہے اور راستہ کھو جاتا ہے۔۔۔۔۔۔

وہ گنگنا رہا تھا، شاید کوئی کلاسیکی دُھن تھی اُس کی آواز بہت
اچھی تھی۔ —— میں نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے پیش کش کی کہ کیوں نہ
ہم کائنات کی وسعتوں اور آسمان کی رفعتوں کی بات کریں ؟

ہاں، ضرور! اگر تم چاہو تو کائنات کی وسعت کو اپنی گفتگو میں سمیٹ
سکتی ہو۔ اور آسمان کی بات ہی کیا، وہ ہم سے بہت قریب ہی تو ہے !
اُس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور آسمان کے اُس کنارے کو دیکھا جہاں
زمین و آسمان ملتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ کائنات میں وہ کونسی شئے
ہے جو ہر مخلوق کو عزیز ہے ؟ بڑا سنجیدہ سوال تھا۔

میں نے کہا، ساتھی !

اُس کی نظریں ٹھہر گئیں، اونچی پیشانی پہ لکیریں اور نمایاں ہو گئیں۔

کیوں کہا تم نے ایسا ؟ وہ دبے سے اُداس لہجے میں پوچھنے لگا "

تم نے کیوں نہیں کہا کہ "روٹی" ؟

کیوں نہیں کہا کہ "خوشی" ؟

کیوں نہیں کہا کہ "زندگی" ؟

میں نے جواب اپنے زاویۂ فکر کے مطابق دیا ہے میرے احساسات اتنے عام نہیں کہ دوسروں کے لفظوں میں سما سکیں ...... میں فطرتاً ضدی تھی، کسی اور کے خیال کو خود پر مسلط نہیں ہونے دیتی، میں نے نادانستہ طور پر تیر چلا دیا تھا، اِس تیر کو اُس نے اپنی مٹھی میں لے لیا۔

احساس لفظوں میں سمانے والی شے نہیں، احساس دل میں سمانے والی شے کا نام ہے۔ دوسروں کے احساس کو اپنا دل اگر محسوس کر لے تو لفظوں کی ضرورت کہاں باقی رہتی ہے؟

اُس کی باتوں میں ہمیشہ سوال ہی زیادہ ہوا کرتے تھے۔

لیکن اِس زمانے میں دل تو غم دوراں کا شکار ہو کر پتھر بن چکے ہیں؟

میرا جملہ سوال بھی تھا جواب بھی۔

تم کیا یہ کہنا چاہتی ہو کہ اس زمانے میں کوئی حساس دل نہیں رکھتا؟

ہاں! یہی سمجھ لیجئے ... تذبذب کے باوجود میں جواب دے بیٹھی۔

تم کس احساس کے تحت مجھ سے ملتی ہو؟ اِس غیر متوقع سوال پر میں گھبرا گئی، مگر جلد ہی قابو پاتے ہوئے کہہ اُٹھی، احساس کئی طرح کے ہوتے ہیں۔

اور ...... اُس کے ہلکے سے قہقہے پر میں خاموش ہو گئی۔

شاہین بہت اونچا اُڑتا ہے یہ کیوں نہیں سمجھتا کہ وہ آسمان کو نہیں

چھو سکتا؟ وہ شاید آج میرے امتحان پر ہی تُلا ہوا تھا۔

شاہین آسمان کو چھونے کے لیے اونچا نہیں اُڑتا بلکہ زمین کے حصار سے دور جانا چاہتا ہے۔ میں اپنے خیالات کی انفرادیت باقی رکھنے پر ہمیشہ آمادہ رہتی ہوں۔

اوہ! وہ کش پہ کش لیتا گیا، اور دُھواں پھیلتا گیا۔

خاموشی کے زنداں میں ہم قیدیوں کی طرح بیٹھے رہے۔

سورج غروب ہو رہا تھا، پرندوں کے غول کے غول آشیانوں کی طرف بڑھے جا رہے تھے۔ اُس کے ساتھ نہ جانے کیوں شام جلد ہو جایا کرتی —؟

آج اُس نے خواہش ظاہر کی کہ تالاب کے کنارے چلا جائے ہم تالاب کی طرف چل پڑے۔ راستے سے کھانے کا کچھ سامان لے کر ہم اُس تالاب کے کنارے اُتر گئے جہاں سے سارے شہر کو پینے کا پانی سپلائی کیا جاتا تھا۔ کچھ اور لوگ بھی وہیں چمن میں تفریحاً آئے ہوئے تھے۔ ہم اُس گول چبوترے پر بیٹھ گئے جہاں درمیان میں ایک خزاں رسیدہ درخت بانہیں پھیلائے لباسِ بہاراں کا منتظر تھا۔

کچھ لوگ کہہ رہے ہیں عنایت ہے زندگی

میں دھیرے دھیرے گنگنا رہی تھی ......

اُس کی قوتِ سماعت بڑی تیز تھی باوجود فاصلے کے میری گنگناہٹ

اُسے سنائی دی۔ ؎

اب کیا بتائیں کس کی امانت ہے زندگی

اُس نے دوسرا مصرعہ پڑھ کر شعر یوں مکمل کیا جیسے کہ میں طفلِ مکتب ہوں

میں مسکرا کر خاموش ہو گئی۔

پانی کے پاس چلیں ـــ؟ میں نے سوال کیا۔

کیوں نہیں ـــ؟ سوال ہی اس کا جواب تھا۔

اور ہم آگے بڑھنے لگے چھوٹے بڑے پتھر، جنگلی خود رو پودوں

کے درمیان سے ہم گزر رہے تھے۔ میں نے اچانک رک کر بڑے سے پتھر

کے بیچ والی دراڑ سے سانپ کی بڑی سی کینچلی کھینچ نکالی۔

ارے یہ کیا ـــ؟ وہ محوِ حیرت تھا۔

یہ سانپ کی کینچلی ہے دیکھئے نا، کس قدر خوبصورت ڈیزائن

بنا ہے اس پر، قدرت کی ہر شئے شاہکار ہوتی ہے، میں نے اصرار

کے ساتھ اُسے سانپ کی کینچلی دکھائی۔

وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔

ہاں، شا...ہ کا...ر

مجھے لگا کہ وہ کہیں گم ہے۔

ہم آگے بڑھ کر پانی کے بالکل کنارے بیٹھ گئے ٹھنڈی ہوا نے ہمیں خوش آمدید کہا، چند لہریں تھرکتی ہوئی قریب آئیں اور مشّاق رقاصہ کی طرح لہرا کر لوٹ گئیں۔

میں نے چھوٹی چھوٹی کنکریاں اُٹھا کر پانی میں پھینکنی شروع کیں۔ ..... ہلکے سے دائرے بنتے اور مٹتے رہے، میں نے ایک بڑا سا پتھر اُٹھا کر پانی میں غیر ارادی طور پر پھینک دیا۔ پانی میں غڑاپ کی آواز کے ساتھ بہت سا پانی اُس کے سوٹ پر اُچھل گیا۔ اُس کی جبیں پر ہمیشہ نمایاں رہنے والی تسکنیں شائد کہیں کھو گئی تھیں۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، اُس نے پھر سگریٹ سلگا لیا۔

پانی میں پتھر پھینک کر لہریں تو پیدا کی جا سکتی ہیں لیکن طوفان نہیں اُٹھائے جا سکتے.....

اُس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

میں خاموش رہی، فضا میں دھوئیں کے دائرے اور زمین پر پانی کے

دائرے دیکھ کر میں بھی خیالوں ڈوب گئی۔

کیا دائروں کے بارے میں سوچ رہی ہو؟ خدا جانے وہ کیسے مجھے پڑھ لیتا تھا۔

نہیں! میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

پھر —؟ سوال کی زنجیر بڑھتی جا رہی ہے۔

میں مرکز کے بارے میں سوچ رہی تھی! میں نے اپنی انفرادیت بہرحال باقی رکھی۔

کیسی عجیب باتیں سوچتی ہو تم؟ ویسے تمہارے پاس سوچنے کی صلاحیت غیر معمولی ہے۔ وہ اعتراف کے زینے طے کرنے لگا۔

میں کشمکش کے زینوں سے اترنے لگی اور ..... ٹھنڈی ہوا کی رفتار تیز ہوگئی۔ اس کی زلفوں میں انتشار پیدا ہوگیا ....

میں نے اپنے بالوں کا جوڑا بنا رکھا تھا۔ ہوا میرا حلیہ نہ بدل سکی مگر اس کی بکھری زلفوں کے درمیان اس کا چہرہ ..... لگا کہ جیسے خضر برسوں سے میرے انتظار میں بیٹھا ہو اور ہولے وقت اس سے لڑنے پر آمادہ ہو ....

گردشِ دوراں جیسے اس کی زلفوں سے الجھ پڑی ہو اور شکست کے قریب ہو۔ میں اسے بدستور دیکھتے ہوئے سوچ کے دھاروں میں بہی جا رہی تھی، دھوئیں کے کئی دائرے میرے آس پاس لہرانے لگے ......

میں سوچ کے عمیق دریا سے نکل آئی ۔۔۔ اُس کی اُنگلیوں میں دیا سگریٹ جلتے جلتے آخری سرے پر پہنچ رہا تھا اور وہ میری طرف منتظر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے مجھ سے وہ "کچھ" سُننا چاہتا ہو۔

میں نے اُسے احساس دلایا کہ سگریٹ جل چکا ہے ایسا نہ ہو کہ "اُنگلیاں فگار" والی بات ہو جائے ۔۔۔۔ اُس نے سگریٹ کا ننھا سا ٹکڑا اپنے چمکدار جُوتے کے نیچے دبا دیا اور دوسرا سگریٹ نکالنے کے لئے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے ٹوک دیا، زندگی دھوئیں کے دائروں سے نکل آئے تو اچھا ہے کچھ ساعتیں خوشگوار مصروفیتوں کی طلب بنی ٹھہری ہوئی ہیں۔

اُس کے ہلکے سے قہقہے نے یقین دلایا کہ وہ میرے اس جملے سے کافی محظوظ ہوا ہے۔

تاش کھیلو گی ۔۔؟

ہونہہ ۔۔۔ یہ بھی پوچھنے والی بات ہے کیا ؟

وہ اُٹھا اور کار سے تاش کا پیکٹ نکال لایا۔

"رمی" کا وہ ماہر تھا ۔۔۔۔ میں بھی کم نہ تھی۔ پھر ہار نے کا سوال ہی کیا تھا۔ کافی وقت تاش کھیلنے میں گزر گیا ۔۔۔۔

اب میری باری تھی، میں جا کر کار سے کھانے پینے کا سامان

لے آئی۔ چھوٹا سا تھرماس، ٹھنڈے پانی کی بوتل دو پیکٹ جن میں "دچیز برگر" اور سینڈوچ تھے جو ہم نے آتے وقت ہوٹل سے لے لئے تھے۔

ہمارا لنچ ختم ہوا۔

کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

تم نے بنائی ہے کافی ؟

ہاں! میرا لہجہ پُرسکون تھا۔

بہت اچھی ہے، لیکن .....

لیکن کیا۔؟ میں فکرمند ہو گئی

تم نے ہاتھ تو نہیں جلا لیا نا !

میں اُس کی بذلہ سنجی پر ہنس پڑی

اُس نے کبھی میرے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی۔

دل نے کہا میں آج اُسے اپنے بارے میں کچھ بتاؤں

آپ نے کبھی میرے بارے میں کچھ نہیں پوچھا ؟

ضروری ہے کیا ؟

پھر بھی.....

کہو، کیا کہنا چاہتی ہو۔

اور میں نے اپنی زندگی کا قصہ مختصر کر کے سُنا دیا۔

اُس نے ہاتھ کا جلتا ہوا وہ سگریٹ پھینک دیا جو ابھی آدھا بھی نہیں جلا تھا۔ نہ جانے کیوں ؟ وہ دوسرا سگریٹ سُلگا کر لمبے لمبے کش لینے لگا اور آنکھیں بند کر لیں ——

اچانک خاموشی توڑتے ہوئے کہنے لگا،

تم ہاتھ کی لکیروں کو مانتی ہو —؟

کسی حد تک ...... میں نے جواب دیا۔

میں پامسٹری سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ اُس کی ہاتھ کی لکیریں میں نے دیکھی تھیں اُس کے ہاتھ میں محرومیوں کے جال میں بنی بڑی سی لکیر، درمیان سے ٹوٹی ہوئی تھی جو کسی جان لیوا حادثے کی نشاندہی کرتی تھی ...... آخر وہی ہوا۔

اور ویسی ہی بڑی لکیر ...... میرے ہاتھ میں بھی ہے۔ ...... لیکن پل پل جینے کی چاہت نے مجھے حادثوں سے ڈرا دیا ہے، تم گاڑی بہت تیز چلاتی ہو اس لئے میں ہی گاڑی میں تمہیں لے آتا ہوں ورنہ میں ایک عرصہ سے پیدل ہی چلتا رہا ہوں۔ چاہتا تھا کہ ...... مگر تمہارے تحفظ کے لئے مجھے یہ گاڑی خریدنا پڑی ،

اب میرا جی چاہتا ہے کہ جیتا رہوں ۔۔۔۔۔ جیتا ہی رہوں ۔۔
کب تک ۔۔۔۔؟ مجھے شرارت سوجھی ۔
جب تک تم جیتی رہو ۔۔۔۔۔۔
قریب تمنّا کا وسیع دائرہ سمٹ کر نقطہ بن گیا ، خاموشی کے تانے بانے میں ہم اُلجھے رہے ۔ کافی دیر بعد میں نے پوچھا ۔
میرا ہاتھ نہ دیکھئے گا کیا ؟ اور اپنا ہاتھ آگے کر دیا ۔۔۔
وہ بڑی دیر تک میرا ہاتھ دیکھتا رہا پھر کہنے لگا ہاتھوں کی لکیریں کبھی بدل بھی جاتی ہیں ان پر زیادہ دھیان نہیں دینا چاہئیے اور پھر لمبے کش لیتا رہا ۔ کچھ دیر بعد کہنے لگا ۔ زندگی موت کے ساتھ چلتی ہے اور موت مقدّر کے ساتھ ۔۔۔۔۔۔
اب چلیں ۔ ؟ میں نے عمداً کہا ۔ کبھی گفتگو اس موڑ پہ آجاتی ہے جہاں ٹال جانا ضروری ہوتا ہے ۔

جب سے میں اُس سے ملنے لگی تھی میں نے وقت دیکھنا چھوڑ دیا تھا ۔ صبح اور شام کی فکر کس کو تھی ۔ ویسے بھی وقت اچھا گزرنے لگا تھا ۔ گھڑی تو وہ لوگ دیکھتے ہیں جن کے لئے وقت گزارنا مشکل ہوتا ہے ۔

کبھی میں بھی گھڑی دیکھ کر رات اور دن گزارا کرتی تھی ...... مگر اب یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں جب اُس سے ملتی ہوں تو صبح ہوتی ہے اور جب لوٹتی ہوں تو رات ہو جاتی ہے ___ مسلسل سوچتے رہنے سے بھی بیداری کی عادت پڑ جاتی ہے۔ کوشش کے باوجود نیند نہیں آتی۔ صرف صبح کا انتظار رہتا ہے۔

کئی ماہ سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ زندگی خوشگوار لمحوں میں ڈھلی جارہی تھی۔ وہ اب ایک سائے کی طرح میری زندگی پر محیط ہو چکا تھا۔

میں نے کبھی اس کا نام نہیں پوچھا۔
ضرورت ہی کیا تھی؟
اُس نے خود بھی نہیں بتایا، اُس نے مجھ سے بھی میرا نام نہیں پوچھا، میں نے بھی نہیں بتایا۔
ضرورت ہی کیا تھی؟
نام سے کیا واسطہ! ذات سے وابستگی اہمیت رکھتی ہے۔
منجارہ کی اس اونچی پہاڑی پر ہم اُفق پر نظریں جمائے بیٹھے تھے
جیسے کہ کچھ کہنا باقی ہے، جیسے کہ سب کچھ کہا جا چکا ہے۔۔۔!

آفتاب سرِ کوہ تھا، چشمِ فلک گلگوں ہو چلی تو نہ جانے کہاں سے اندھیرے سمٹ آنے لگے، ہمارے اطراف پھیلے ہوئے سرمئی اندھیروں کا احساس دونوں میں سے کسی کو بھی نہیں تھا۔ شام کا پہلا ستارہ چمکنے لگا تھا۔ میرا جی چاہا کہ کوئی اچھی سی غزل وہ مجھے ترنم سے سنائے تو کتنا اچھا ہو۔ میں نے فوراً فرمائش بھی کر ڈالی۔

آج اُس کے ہونٹوں پر اتنی گہری مسکراہٹ نظر آئی کہ دانتوں کی اُجلی قطار کی روشنی بھی جھلک اُٹھی، مسکراہٹ بکھیر رکھی ۔۔۔۔ سے

نہ خیال سی نہ تو خواب سی مری زندگی ہے کتاب سی
فقط ایک حرف تھا آرزو جسے میں نے خود ہی مٹا دیا

میں اُس "حرفِ آرزو" پر چونک پڑی، بڑی پُرسوز آواز میں غزل سراپا غزل تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کیا حرفِ آرزو مٹایا جا سکتا ہے؟

وہ مسکرا دیا، کوشش بھی نہیں کی جا سکتی کیا؟ پھر وہی سوال۔۔۔

۔۔۔اُف ــــ کیا تم کچھ نہیں سناؤ گی۔؟

میں جواب میں شروع ہو گئی۔ ــــ

میں خود بھی ایک درد کی دنیا ہوں کیا کروں
یعنی کہ اک فریبِ تمنا ہوں کیا کروں

وہ بڑے انہماک سے غزل سُنتا رہا اور غزل ختم ہوتے ہی کہنے لگا۔

یہ "فریبِ تمنا" کیا ہے؟

فریبِ تمنا درد کی دنیا میں ہوتا ہے، آپ کیا جانیں؟ میرے لہجہ میں شوخی تھی۔

وہ تقریباً سال بھر میں پہلی بار قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

آسمان پر پہلے ستارے کی دمک بڑھ گئی۔

درد کی دُنیا تم نے دیکھی ہے کبھی ——؟

ہاں! میں نے صرف اُس ایک لفظ پر اکتفا کیا۔

کچھ اور سُناؤ! تحکمانہ لہجہ گونج اُٹھا۔ ـــــ

وہ جس کو سُن کے زمانے کو آپ ٹھکرا دیں

وہ بات آپ سے ہم نے ابھی کہی ہے کہاں

کونسی بات؟ وہ بہت سنجیدہ تھا

جی! میں گڑبڑا گئی۔

کیا کوئی بات ایسی بھی ہوتی ہے جس کے لئے زمانے کو ٹھکرا دیا جائے۔۔؟

میں نے اُس کے ہر سوال کے لئے خود کو تیار کرتے ہوئے کہا،

ہاں، ہوتی ہے بالکل ہوتی ہے!

کونسی بات ہے وہ، جو تم کہہ نہیں سکتیں؟

وہ ... وہ ... دہی بات ... یعنی کہ دل کی بات

میں بُری طرح جھینپ گئی ——— ہواؤں کی سرسراہٹ میں انقلاب کی آہٹ تھی۔ دل کی بات لفظوں میں بانٹ کر دل کے جذبوں کی توہین کرنا کیا مناسب ہے؟ اُس کے لہجہ میں کسی قدر جرح کا انداز تھا۔

مگر ..... یہ تو شاعری ہے، میں نے راہِ نجات ڈھونڈی۔

تو کیا شاعری میں صداقت نہیں ہوتی ——؟ مجھے ہر سوال کا جواب دینا تھا۔ اندھیرے میں اُس کے کوٹ کے بٹن چمک رہے تھے۔

ہاں! شاعری میں صداقت ہوتی ہے بالکل اُسی طرح جیسے کہ اس رات کے اندھیرے میں کرنوں کے چھپے ہوئے قافلے .....!

"تم" شاعرہ تو نہیں ——؟

آپ شاعر ہیں کیا ——؟

ذوق رکھنا جرم ہے کیا ——؟ ہلکی سی مُسکراہٹ۔

ہر جرم کی سزا ہے کیا ——؟ ہلکی سی مسکراہٹ

میں نے دیکھا آسمان پر دمکنے والا پہلا ستارہ گہرے بادل میں جا چھپا تھا اور اِکّا دُکّا بوندیں زمین پر ٹپکتی جا رہی تھیں۔ ہوا میں خنکی آ گئی، بہت دور نشیب میں ٹمٹماتی روشنیوں کا ہجوم بڑھ گیا، ہم وہاں سے لوٹ آئے۔

سبزۂ خوابیدہ پر ہم بڑے آرام سے بیٹھے محوِ نظارہ تھے۔ آس پاس بیلیں، پودے، کچھ درخت اور اونچی چٹانوں کے کٹے ہوئے سر بکھرے پڑے تھے۔

آپ نے کبھی اپنا ٹیلیفون نمبر نہیں بتایا، میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

میں ٹیلیفون نہیں رکھتا، بات ہی کس سے کرنی ہے؟

مجھ سے بھی نہیں ——؟ میں مسکرائی۔

ٹیلیفون پر بات کرنے سے کیا فائدہ؟ بالمشافہ گفتگو زیادہ اہم ہوتی ہے۔ دو چار کش اس نے لے کر ہاتھ سے سگریٹ پھینک دیا —— میں اس کی معقول باتوں سے بڑی متاثر رہتی۔

پھر بھی میرے تحفظ کے لئے کار رکھ لی ہے تو مجھ سے بات کرنے ٹیلیفون بھی لے لیں! میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

فون پر بات چیت دھوکہ ہو سکتی ہے۔ ہمکلام کا نہ چہرہ دکھائی دیتا ہے نہ تاثرات، صرف آواز، صرف لفظ، گفتگو ادھوری لگتی ہے۔ یہ اس کا نظریہ تھا —— معلوم نہیں اس نے کیا کہا تھا میں اس وقت چونک پڑی جب اس نے مجھے متوجہ کرنے کے لئے ایک کنکر میری طرف اچھال دیا ——

کیا سوچتی رہتی ہو تم ——؟

وہی جو مجھے سوچتے رہنا چاہیئے ! میں اُداس ہو کر بھی ہمیشہ اپنے آپ کو بہت شوخ ظاہر کرتی لیکن جب اُس کا سامنا ہوتا تو میں بہت سنجیدہ ہو جاتی، پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا۔ ؟ ـــــ خاموشی ہمارے درمیان کچھ بول رہی تھی لیکن وہ عام لفظ نہیں تھے ان کے معنی بھی سطحی نہ تھے، احساس کے معنے گہرے اور لفظ وزنی ہوتے ہیں ـــــ آخر سُرمئی فضاء میں اُس نے ہی خاموشی توڑ دی۔

کوئی خواب سُناؤ۔ ؟ بڑی عجیب فرمائش کی تھی اُس نے، وہ بھی اس طرح جیسے کسی شاعر سے غزل سُنانے کی فرمائش کی جائے۔

میں سمجھ گئی کہ وہ میرے وجود کی راکھ میں میری ذلت کی چنگاریاں کریدنا چاہتا ہے، میں نے راکھ پر شبنم کی تہہ جما دی۔۔۔ ۔۔۔اور کہا۔ ایک کیا میں تو کئی خواب سُنا سکتی ہوں، سُنیئے ! پرسوں ہی کی بات ہے ـــ میں نے دیکھا کہ میں مر گئی ہوں اور بہت سی عورتیں اکٹھا ہو کر روتی اور ماتم کرتی جا رہی ہیں۔ میری میّت کو بہت اونچے تخت پر رکھا گیا ہے۔ اچانک رونے والیاں خاموش ہو جاتی ہیں اور اِدھر اُدھر سرکنے لگتی ہیں کہ کوئی آ رہا ہے ـــــ وہ دیکھو اس طرح کی آوازوں کے درمیان میں دیکھ رہی تھی کہ کوئی میری میّت کی طرف آیا اور اپنی جیب سے ایک سُرخ

حسین جالی دار کپڑا جو زرّیں نقش و نگار سے آراستہ تھا مجھ پر ڈال دیا اور میں زندہ ہو گئی ـــــــ میں اُٹھ کر بیٹھ گئی ـــــــ

بہت خوب، بہت خوب ـــــــ

اُس نے گویا مشاعرے میں بیٹھے سامع کی طرح داد دی۔

اور ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ میں بہت بیمار ہوں اور دمِ آخر ہے کوئی مجھ سے ملنے آیا ہے میں کہہ رہی ہوں " یہ میرا آخری وقت ہے آپ تو زندہ رہیں گے لیکن مجھے یاد کرتے رہیئے بھولیئے گا نہیں !" اُس نے اشک بار آنکھوں سے یہ شعر پڑھا ؎

مِل بھی جائے اگر تو یہ دنیا
بِن تمہارے حسین کیا ہو گی

اور میری آنکھ کھُل گئی ـ ـ ـ ـ ـ

کیا تم نے میری آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے ـ ؟ سوال بڑی ہی سنجیدگی سے کیا گیا تھا۔

ہاں ! میں نے اُن آنسوؤں کو پلکوں سے ڈھلکتے بھی دیکھا تھا ـ ـ ـ

تو اپنا دامن کیوں نہیں بڑھایا ـ ؟ اُس کے سوال پر میں شرمندہ ہو گئی پھر بھی کہا کہ خواب ٹوٹ جو گیا تھا ـ ـ ـ ـ ـ !!

کرتا ہے......۔

کیا سوچ رہی ہو ؟

کچھ نہیں، بس ایسے ہی......۔

کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ "ہم دوسروں سے بالکل مختلف سوچتے ہیں"

ہمارے احساس میں عامیانہ پن نہیں بلکہ مخصوص انداز پایا جاتا ہے۔؟

ہاں! ایسا ہے تو سہی لیکن ہم ممکنات کی دنیا میں بستے ہیں، ہو سکتا

ہے کچھ اور لوگوں کا اندازِ فکر بھی ہماری سوچ سے مشابہت رکھتا ہو....؟

نہیں، میری طرح کا آج تک کوئی سایا بھی نظر سے نہیں گزرا، صرف

تم کو ہی خود سے ملتا جلتا محسوس کرتا آیا ہوں۔ دنیا میں ہم خیال بہت سے

لوگ ہوتے ہیں لیکن "ہم نفس" سے محرومی عام ہے۔ چند ہی خوش نصیب

ایسے ہوتے ہیں جنہیں "ہم نفس" مل پاتا ہے، تمہارا کیا خیال ہے ؟

میں بظاہر اُس کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن ذہن اُس ایک لفظ "ہم نفس"

کے جال میں اُلجھا ہوا تھا۔ شائد میں نے جواب نہیں دیا۔

اُس نے پھر کہا! کہاں کھو گئی ہو تم —؟

"ہم نفس" کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

دھندلاتی روشنیاں اشارہ دے رہی تھیں کہ واپسی کا وقت ہو گیا ہے۔ آسمان پر تاروں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی، ہم واپس ہو گئے۔ راستے میں اُس نے کہا۔

کل تم جلد آنا تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔

میں سُن سی ہو گئی، کبھی اُس نے ایسا نہیں کہا آج کیوں .....

کیا۔؟ میرا دل حلق میں اُچھل کر آ گیا۔ کسی نہ کسی طرح گھر پہنچ کر میں کھانا کھائے بغیر سو گئی۔

آدھی رات کو خود بخود میری آنکھ کھل گئی۔

خوابوں کے شامیانے بیداری کے تیز جھونکوں نے اُکھاڑ پھینکے پتہ نہیں کیوں دل بے چین سا تھا۔ میں نے دائیں سے بائیں کروٹ بدلی، خیالوں کے پرندے ذہن کے اُس جزیرے پر آ بیٹھے جہاں میرے ماضی کی خوبصورت وادیاں مہک رہی تھیں، زوالِ ماہ کے باوجود تصوّرات کی دنیا میں چاندنی پھیل گئی۔

آدھی رات کو جب آنکھ کھل جاتی ہے تو انسان تنہا ہو کر بھی تنہا نہیں ہوتا۔ ویسے بھی ذہن ایک مسافر ہے جو ہمیشہ حال سے ماضی کی طرف ہجرت

خیر، چھوڑو، اُس نے بات کا رُخ موڑتے ہوئے کہا۔
کیوں نہ ہم اپنی اپنی سوانح حیات لکھیں ــــــ ؟
ہاں، ہاں، کیوں نہیں، ضرور! میں بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔
میں اپنے حالاتِ زندگی لکھوں اور تم اپنی آپ بیتی لکھو، دیکھیں کس کی سرگذشت پہلے مکمل ہوتی ہے ــــ ؟
میں بہ خوشی راضی ہو گئی۔

ہم نے واپسی میں اسٹیشنری کی دوکان سے ضروری چیزیں خریدیں وہیں ایک شیشے کا پیپر ویٹ جس کی شکل دل جیسی تھی رکھا تھا میں نے اُسے بھی لینا چاہا تو اُس نے مجھے روک دیا،
کیا تمہیں کم نظر آتا ہے ؟ اُس نے ایسے پوچھا جیسے کہ میری بینائی کھونے والی ہو۔

کیا ــــــ ؟ مجھے عجیب سا لگا۔
دیکھتی نہیں تم، شیشے کے دل میں بال ہے اور ٹوٹے ہوئے دل کو کوئی نہیں خریدتا، دل کا سودا، دل سے ہوتا ہے۔ دل کا ٹوٹا ہوا ہونا اتفاق ہے، میں نے جواب دیا۔
ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنا آسان ہے کیا ــــ ؟ وہی سوال ....

میں نے اُس کی شخصیت کو اپنی عقل کے میزان میں تولا، ترازو جھول رہی
تھی.......

ٹوٹا ہوا دل بہت اہم ہوتا ہے! میں نے معلومات فراہم کیں۔
"شکستہ دلی کبھی "شکستِ دل" بھی ہو جاتی ہے" اُس نے اندیشہ ظاہر کیا۔
اِس میں شان ہوتی ہے، میری ضد بدستور تھی، اُس نے سگریٹ کی
راکھ کو چٹکی سے جھٹک دیا۔

ہم کچھ ایسے باتوں میں محو ہو گئے کہ بیپر ویٹ لئے بغیر لوٹ آئے۔
راستے میں اُس سے میں نے پوچھا بھی کہ کیا سوانح حیات کی بساط پر
تلخیٔ دوراں کے کانٹوں کے علاوہ اُن ننھے مہکتے خوابوں کے دامن بھی پھیلائے جا سکتے
ہیں جو کبھی پلکوں سے شبنم کی طرح ڈھلک چکے ہوں؟
ہاں، ہاں، سبھی کچھ، سبھی کچھ! سوانح حیات میں ہر وہ واقعہ ہر وہ بات قلمبند
ہونی چاہیئے جس کے ساتھ ہم شعور سے لاشعور تک سفر کرتے رہے ہیں......
پتہ نہیں کب میری آنکھ دوبارہ لگ گئی۔
صبح قریب تھی کہ کال بل بجنے لگی۔ مسلسل ٹرن، ٹرن سے ملازم بھی جاگ
گئے ملازم سے معلوم ہوا کہ میری خالہ ناہید بیگم کو دل کا شدید دورہ پڑا ہے۔ اوپن ہارٹ
سرجری کے لئے انہیں مدراس لے جانا ہوگا۔ فی الحال مقامی ہاسپٹل میں ایمرجنسی وارڈ

میں رکھا گیا ہے۔ میں نے فوراً ڈرائیور کو بلوایا اور خالہ کے گاؤں چل پڑی
تین گھنٹے میں ہی سفر تمام ہوا۔ دواخانہ پہنچ کر ایمرجنسی وارڈ کے دروازے
پر لگے شیشے سے اندر جھانکا۔ ناہید خالہ مکڑی کی طرح تاروں اور
پائپوں کے جال میں بے ہوش پڑی تھیں۔ میں نے مکڑی کے جالے میں
پھنسی اُس مجبور صورت کو دیکھا جس کو کبھی زندگی نے اپنے رشتے
کی قید سے آزاد ہونے سے روک رکھا تھا۔

ناہید خالہ تنہا تھیں اولاد ہوئی نہیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد
بیوہ نند کے ساتھ ہی رہنے لگیں۔ اُنہیں اپنی شوہر کی زمینداری کی
دنیا بہت پسند تھی۔

میں بھی سر جھکائے کھڑی رہی۔ میری آنکھوں میں آنسو
نہیں تھے۔ آنسو پیتے رہنے سے وہ دل کے اندر کہیں منجمد ہو چلے تھے۔
۔۔۔ تمام ہوئی پھر بھی ناہید خالہ کو ہوش نہیں آیا۔ یونہی تین دن
گزر گئے۔ میں شہر لے جانا چاہتی تھی مگر ڈاکٹر نے اجازت نہیں دی
کہ ہلکی سی جنبش بھی اُن کے لئے فی الحال خطرناک ہے دل کے دورے
کے وقت گرنے سے سر پہ گہری چوٹ نے دماغ ماؤف کر دیا ہے اُنہیں
ہوش آنے کے بعد ہی آگے کے بارے میں سوچا جائے گا۔۔۔۔

اُن کے ہوش میں آنے کی آرزو لئے میں وہیں بنچ پر بیٹھی رہی۔ سارے منظر دُھندلا گئے اور میرے سامنے وہ "آگیا کہ اُس نے مجھے آخری دفعہ جلد آنے کو کہا تھا معلوم نہیں وہ کیا سمجھ رہا ہوگا۔۔۔۔؟

طلوعِ آفتاب کا منظر غروبِ آفتاب کا پیش خیمہ ہوتا ہے

پھر تھے دن صبح ناہید خالہ کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا۔ دل ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ کر رہ گیا۔

وقت کی لکیر پیٹنے سے حادثوں کے سانپ نہیں مرتے مگر زندگی کی لاٹھی ضرور ٹوٹ جاتی ہے۔ میری زندگی بیدِ لرزاں کی طرح تھی لچکتی ضرور مگر ٹوٹ نہیں پاتی میں اپنے گھر لوٹ آئی۔

میں نے یونہی ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا آواز گونج رہی تھی ؎

پچھلے پہر جو روتا ہوگا

میری طرح وہ تنہا ہوگا

لفظوں کے کارواں آواز کے صحرا سے گزرتے رہے مگر مفہوم کی منزل کہیں نظر نہیں آئی۔

کمزور لوگوں کی پلکیں بھیگتی ہیں حوصلہ مند لوگوں کی آنکھیں خشک رہتی ہیں اور میں بہر حال حوصلہ مند تھی۔ کرب کو پینا جانتی تھی۔ غم کے شعلے

نکلنے کا ہنر آتا تھا۔ اُداسیوں کی طوفانی موجوں کو میں اپنے اندر جذب کر لینے کے فن سے بخوبی واقف تھی۔

زندگی، ہاتھ کی لکیروں سے کم نہیں آڑی، ترچھی، ٹیڑھی اور کہیں کہیں بالکل سیدھی اُس چوراہے کے راستے کی طرح جہاں "وہ" میرا منتظر رہا کرتا تھا تقریباً دس روز گزر چکے میں اُس سے مل نہ پائی تھی۔

میں نے سوچا وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا مجھے جانا چاہیئے ۔۔۔۔
لیکن میں روز اُس جگہ کے آخری سرے تک جاتی اور ناکام لوٹ آتی۔
دن تلاش میں گزر جاتا رات خوابوں کے خیموں میں کٹ جاتی۔

ایک دن ـــــــ

اچانک مجھے فرحانہ کی یاد نے بے چین کر دیا۔ میں نے واقعی اُسے فراموش کر دیا تھا میں اُسی چوراہے سے گزر کر فرحانہ کے پاس گئی، وہ بہت ناراض تھی مگر جب خالہ ناہید کے انتقال کی خبر سُنی تو بے حد رنجیدہ ہو گئی۔ ناہید خالہ اُسے بے حد چاہتی تھیں۔ شاید اِس لیئے بھی کہ وہ خود اُسی کی طرح تنہا تھیں۔ دونوں کہانیوں کا انجام ایک جیسا تھا۔

ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

فرحانہ نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

تم بہت بدل گئی ہو، کچھ ہی دن میں اتنی تبدیلی — ؟

دل کے غم کو میں نے ہونٹوں پہ تبسم بنا کر سجا دیا۔

چہرے پر اداسی، سر پہ بکھرے بالوں کا جنگل، آنکھوں میں اضطراری کیفیت، باتوں میں پہلی جیسی یکسانیت بھی نہیں، لہجے میں لڑکھڑاہٹ، ناہید خالہ کا اتنا غم بھی نہ کرو، سوچو تو انہیں اپنی تنہائیوں سے نجات مل گئی۔ غم کے بادل ان پر چھائے رہے تو وہ خود کرب کے طوفان سے گزر کر آگے بڑھ گئیں جہاں نہ غم ہے نہ کرب، بس ایک مستقل سکوت کا عالم ----

فرحانہ مجھے تسلیاں دے رہی تھی۔ اسے میرے دردِ پنہاں کی خبر ہی نہ تھی۔ شائد وہ نہیں جانتی تھی کہ مرنے والے لوگ یادوں میں شامل ہو جاتے ہیں لیکن جو جیتے جی کھو جاتے ہیں۔ ان کی تلاش زندگی کا حاصل ہو جاتی ہے۔

میری ذات سے جڑی ہوئی فرحانہ کو میں نے "اس" کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا تھا "وہ" رازِ پنہاں کا تیر بنا میرے دل میں کبھی کا پیوست ہو چکا تھا۔ اگر فرحانہ میری چارہ گری پر اتر آتی تو یقیناً اس تیر کو کھینچ کر پھینک دیتی، وہ اپنے سوا کسی پرچھائیں کو بھی میرے خانۂ دل کے قریب برداشت نہ کر پاتی، مگر میں اس مرتبہ اس کی بے لوث دوستی میں خیانت کر چکی تھی، میں نے بڑی ہوشیاری سے اپنے چہرے پر ایک دبیز نقاب ڈال لیا تھا۔

اُس چاند کو چھپانے کے لئے جو میری پیشانی پر "مہرِ تمنا" کی طرح ثبت ہو گیا تھا، اور اُس کی ٹھنڈک اس کی روشنی میں کسی کو بھی میں نے شریک نہیں کیا تھا۔ بہرحال میں فرحانہ سے آتے رہنے کا وعدہ کر کے لوٹ آئی۔

دوسرے دن!

میں فرحانہ کے اِسکول جا رہی تھی کہ اچانک چونک پڑی۔۔۔۔

بہت لمبی لمبی زُلفیں گرد میں اَٹ کر بٹی ہوئی رسّی کی طرح لگتی تھیں، پھٹے پرانے میلے کپڑے، قمیض اور پاجامہ کوئلے کی طرح سیاہ جو اُس کی سلونی رنگت کو بھی سیاہ کر رہا تھا، وہ میری رہگذر پر گُم سُم بیٹھا تھا۔ جہاں میں نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا اور پھر میں بار ہا اُس سے ملتی رہی تھی اُسی جگہ وہ اِس حال میں مجھے ملے گا میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ میں نے گاڑی قریب روک دی اور خود اُتر کر اُس کے بالکل سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ بدستور اجنبی بنا بیٹھا رہا۔ نہ جانے کونسا جنون اُسے اِس موڑ پر لے آیا تھا۔ اُس کے میلے ہاتھ پاؤں دیکھ کر مجھے اُس کی نفاست اور بے شکن لباس کی یاد آ گئی میں نے اُس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر ـــــ وہ تو ہوش و حواس سے عاری تھا ـــــ اُس کے تمام سوال اُسی کے جنون کے بھنور میں کھو چکے تھے۔

فٹ پاٹ پر وہ خاموش بیٹھا دُور خلاؤں میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا

..... شائد مجھے .... شائد اپنے سوالوں کے جواب .... یا پھر رموزِ

کائنات .... یا پھر وہ نقطہ جو زندگی کے سادہ ورق کو داغدار کرتا ہے

..... میں آنکھوں میں سیلِ رواں لئے لوٹ آئی ــــــ ؎

جذبات آنسوؤں کی زبان بن کے رہ گئے

اُس ایک شب کا فاصلہ کتنا طویل تھا

تلاش کا حاصل کیا یہی ہے ؟

میں اپنے اندر چیخ پڑی .... میں مسلسل چیخنے لگی اندر ہی اندر

تڑپتی رہی ۔ آدھی رات کو یہ طوفان کچھ تھمنے لگا تو میں نے یادوں کی تمام

کھڑکیاں کھول دیں .... !!

کبھی اپنے بارے میں بھی سوچ لیا کرو "وہ" سنجیدہ تھا ۔

حالات کے تانے بانوں میں زندگی کو نہ اُلجھنے دو تو بہتر ہے وہ

کش پہ کش لینے لگا ....

اپنے بارے میں سوچنے کی فرصت ہے نہ ضرورت یہاں دوسروں

کے بارے میں سوچنا اہم فریضہ ہے اور .... میں نے بات پوری بھی

نہیں کی وہ بول پڑا ۔

تو ٹھیک ہے تم دوسروں کے بارے میں سوچتی رہو اور .....
اور میرے بارے میں بھی کبھی غور و فکر کر لو تو اچھا ہوگا۔ کچھ تو رہنمائی ملے گی
اُس کی متانت پر مسکراہٹ غالب تھی۔

میں روز فرحانہ کے پاس جاتے وقت اُسے دیکھتی، دھوپ بارش
سے میں نے کبھی اُسے بچتے ہوئے نہیں دیکھا۔ گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں وہ
یوں بیٹھا رہتا جیسے چاندنی کی سحر آگیں کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔
وہ موسلا دھار بارش میں پتھر کے بُت کی طرح جما رہتا جیسے یہ بارش اُس
کے لئے موسمِ بہار کی پہلی پھوار ہو، جو جسم کو بھگو کر روح کو مہکا دے رہی ہو...
میں اُس کے بارے میں زیادہ سوچنے لگ گئی وہ نہ جانے کیسے زندگی
کی ضرورتیں پوری کرتا ہوگا۔ کون اِسے کھلاتا پلاتا ہوگا۔؟...... وہ جو
نفیس سوٹ پہنے دھوئیں کے مرغولوں کے درمیان رہا کرتا تھا، آج وہ جنون
میں محصور ہو گیا تھا۔

اُس کی حیات کے دائرے تنگ ہو گئے تھے۔ اُس کی سوچ اور
دانشمندی خاموشی کا کفن پہن چکی تھی۔ وہ ذات سے مر چکا تھا، جسم
سے زندہ تھا ــــــــ

شہر کے اس گنجان علاقے میں گداگروں کے سے انداز لئے اُس کا چپ چاپ بیٹھا رہنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ مجھے تعجب ہوتا کہ اتنے لوگوں کے درمیان وہ کتنا اکیلا ہے، کوئی اسے نہلاتا نہیں آخر کیوں؟ کوئی اسے دوسرا لباس پہناتا کیوں نہیں ــــ؟

مجھے اُس دن کی آخری ملاقات یاد آئی جب اُس نے مجھ سے دوسرے دن جلد آنے کو کہا تھا۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ ضروری بات کرنی ہے ــــــــ

میں ایک عرصے سے اُس کو ایسے ہی گم سُم بیٹھا دیکھ رہی ہوں۔ اُس کی خاموشی کا راز میں اب بھی سمجھ نہیں پائی، نہ جانے وہ کیا کہنے والا تھا۔۔۔۔۔!

آج وہ فٹ پاتھ کے کنارے سیدھا کھڑا تھا۔ انداز چیلنج کرنے والا تھا مگر۔۔۔۔۔۔ اس کے سر پہ پٹی بندھی دیکھ کر میرے دل کے زخم رِسنے لگے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ خدا جانے اُسے یہ چوٹ کیسے آئی۔ آس پاس کے لوگوں نے شاید اُس کی مدد کی ہوگی۔۔۔۔۔۔

رِستے زخم چشمِ تمنا سے بہنے لگے۔ میں اس سلسلے میں کاش کچھ کر سکتی لیکن نسوانی وقار کی دیوار سے آرزو ٹکرا کر زخمی ہوتی رہی۔ ــــ

آج وہ مجھے عجیب انداز میں نظر آیا وہی خاموشی کا لبادہ اوڑھے بیچ سڑک پر کھڑا تھا۔ اس کے بالکل قریب سے کئی تیز رفتار گاڑیاں گزری جا رہی تھیں۔ اسے حادثے کا ڈر لگتا نہ تھا، کسی نے اس کے ہاتھ میں جلتا ہوا سگریٹ دے دیا وہ کش پر کش لگا رہا تھا، میری آنکھوں میں دھوئیں کے بادل برسنے لگے ......

فرحانہ کے اسکول سے اب مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی، میں تو صرف اُسے دیکھنے کے لئے اُس رہگذر سے گزرنا چاہتی تھی جو میری ذات کا ایک حصّہ بن چکا تھا جو ایک محور کی طرح میرے زاویۂ فکر پہ گھوم رہا تھا۔ ــــــ

میں بہت دیر اُسے دیکھتی اور پھر گھر لوٹ آتی۔ گھر آ کر مٹی کی کئی چیزیں بناتی، کبھی گلدان کبھی کوئی کھلونا، کبھی کچھ کبھی کچھ ......

مجھے مٹی کے کھلونے بنانے کا بڑا شوق تھا بچپن ہی سے میں اس فن میں ماہر تھی۔ کبھی کبھی دل بہلانے کے لئے مٹی کے کھلونوں کے علاوہ آدمی کا چہرہ بھی بنا لیتی۔ میرا موجودہ رہائشی مکان میرے ابّو ہی کا تھا۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد اس مکان میں مقیم تھی جہاں میرے ابّو کی آواز گونجتی تو کبھی امّاں کی چوڑیاں کھنکتیں ــــــ

میری تعلیم بھی زیادہ نہ ہو سکی۔ صرف بی۔ ایس۔ سی کے پہلے سال

بعد بھی شادی ہوگئی، گھوڑے سواری میرا محبوب مشغلہ تھا، طوطے پالنا اور عرصہ دراز تک انہیں پنجرے میں قید رکھ کر اُن سے مانوس ہوکر انہیں رہا کرنا اپنے دل کو تڑپانا میری عادت تھی۔ کبوتروں کے پاؤں میں جھانجن باندھ کر ان کا رقص گھنٹوں دیکھتی رہتی۔ میں نے اچھے اچھے شاعروں کا منتخبہ کلام اپنے پاس محفوظ رکھا تھا۔ مجھے مختلف قسم کے پتھر جمع کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ اور تو اور کانٹے بھی میں نے طرح طرح کے جمع کر رکھے تھے۔ تتلیوں اور پرندوں کے پر میرے البم کی زینت تھے۔ خزاں رسیدہ درختوں کی تصویریں کھینچنا مجھے بے حد پسند تھا۔ میرے گھر کے ورانڈے میں کئی طرح کے گملے سجے تھے۔ گلاب سبھی کو اچھے لگتے ہیں مگر مجھے دیسی گلاب بہت پسند تھے جن کی مہک سارے گھر میں میری طرح گھومتی رہتی جن کا ہلکا گلابی رنگ میرے لباس سے اس قدر میل کھاتا کہ اگر میں گلاب دامن میں رکھ لیتی تو نظر نہ آتے۔

مگر ـــــــ

اب زندگی صرف تکمیلِ ضابطہ ہی ہوتی تھی۔ ؎

خزاں کی رُت نے تو سب کچھ جلا دیا لیکن

کہاں میں جاؤں کہ نسبت ہے آشیانے سے

میں ہر روز اُسے کبھی فٹ پاتھ پر یا بیچ سڑک پر خاموش بیٹھا یا کھڑا ہوا دیکھتی رہی۔ اُس کی زلفیں بہت ہی لمبی ہو چلی تھیں۔ گاؤں کی اُن پگڈنڈیوں

کی طرح جو کبھی بھی کہیں ختم ہوتی نظر نہیں آتیں۔ کپڑوں کا نہ جانے کونسا رنگ تھا جو اب مٹی کی رنگت اختیار کرچکا تھا وہ جو خود بھی کھلتی ہوئی گندمی رنگت رکھتا تھا اب "مٹی کا آدم" بن چکا تھا۔۔۔۔۔

میری اضطرابی کیفیت نے میری صحت کو کافی متاثر کردیا تھا۔ میرے دل کو چین نہیں تھا۔ مجھے رہ رہ کے اُس کا خیال آتا رہتا ــــــ

یہ وقت بھی کتنا ظالم ہے اُس کا نتیجہ کس قدر خونخوار ہے۔ میرے دل کو ہی نہیں اُس نے میری روح کو بھی زخمی کردیا ہے، لیکن ــــ یہ خراشیں کسی کو نظر نہیں آسکتیں اور وہ ــ؟ وہ تو بہت ہی زخمی ہوگیا ہے۔ وہ ہوش و حواس ہی نہیں میری دنیا سے بھی بہت دور جاچکا ہے۔ ــــ

چھوڑ کے سب کو جانے والا

میری طرف بھی دیکھا ہوگا

میرا تکیہ آنسوؤں سے بھیگتا رہا۔

ماضی زخم بن چکا، اُس کی دوا کہاں سے لاتی ــ؟

کون مداوا کرتا۔۔۔۔؟

مسیحا ہوش کھو بیٹھا تھا بیمار کا حال کون پوچھتا ــ؟

کون کہتا کہ تم اچھی ہوجاؤ گی؟

دل کے عارضہ...... اور خوشگوار لمحے ... یاد سینے میں دردین گئی
میں نے گولی کھائی نیند کے دامن میں پناہ لینے کو ______

دھوئیں کے نرم بادل نیند بن کر چھا گئے یہ بادل اتنے گہرے تھے کہ خوابوں کے سرکش وجود بھی ان کا سامنا نہیں کر پائے اور میں صبح تک سوتی رہی ___ کافی دن نکل آیا تھا۔ آنکھ کھلی تو دیکھا اخبار میرے بازو والی میز پر رکھا ہے میں نے پڑھنا شروع کیا۔ آخری صفحہ پر اُس کی تصویر تھی۔ بہت بڑی سُرخی کے ساتھ ۔

"دیوانے مصوّر کا شاہکار مٹی کا مجسمہ"

تفصیلی خبر یہ تھی دو راتوں رات ایک نیم پاگل مصوّر نے معمولی مٹی سے ایک عورت کی شاہکار مورت بنا ڈالی اور وہ اُس مورت سے محوِ گفتگو ہے۔

ع
میں خود بھی ایک درد کی دنیا ہوں کیا کروں
یعنی کہ اک فریبِ تمنّا ہوں کیا کروں

مجھے سینے میں درد محسوس ہوا میں نے ملازمہ کو آواز دی۔ وہ دوڑی چلی آئی۔ دوا دی اور پاس بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد طبیعت سنبھلی۔ ملازمہ نے فون کر کے ڈاکٹر کو بلوا لیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ کچھ گھٹن کی وجہ سے آپ کی صحت بگڑ رہی ہے۔ بہتر ہے کسی دلچسپی کو اپنا لیں۔ یا کوئی ایسی مصروفیت

ہو جہاں پرانی باتیں سوچنے کی مہلت نہ مل سکے۔ ــــــــــ

ڈاکٹر دو ہی چیزیں تو دیتے ہیں۔ ایک دوا، دوسرا مشورہ، سو تو وہ دے کر چلے گئے اور میں پھر "فریبِ تمنّا" میں پھنس گئی۔۔۔۔

آخر میں نے وہیں مٹی منگوائی اور کھلونے بنانے بیٹھ گئی۔ میں نے پہلی بار ایک بڑا مٹی کا آدمی بنایا۔ اور اس کا چہرہ ۔۔۔۔ جیسے کہ "وہ" اب بات کرتے ہی والا ہو "وہ" اب میرے سامنے ہی تھا ــــــ

دوسرے دن صبح!

میں اُسی رہگذر پر تھی جہاں "وہ" مٹی کا مجسمہ بنائے دو زانو بیٹھا ہوا تھا۔ کئی لوگ وہاں جمع تھے۔ میں نے گاڑی سے اترنا مناسب نہیں سمجھا وہیں سے مجسمے کو دیکھا جو ۔۔۔ جو بالکل میری طرح تھا۔ جنون نے فرزانگی کے ہاتھ میں آئینہ دے دیا تھا ۔۔۔۔ میں فوراً وہاں سے چلی آئی۔ شام ہو گئی۔ میں نے کمرے میں آج روشنی نہیں کی، میں اس اندھیرے میں یادوں کے چراغ جلاتی رہی۔ دل کا دامن سُلگتا رہا، آرزو کے کئی آتش فشاں پھٹ پڑے۔ سسکیاں اور آنسو لاوے کی طرح بہہ نکلے ۔۔۔

اور پھر آدھی رات کے بعد ــــ

میں وہ مجسمہ گاڑی میں رکھ کر اُسی چوراہے پر گئی جہاں وہ اب بھی

اُس مجسّمہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ میں نے چپکے سے اُس مجسّمے کے بازو اپنا بنایا
ہوا مجسّمہ رکھ دیا اور چلی آئی۔ شائد اُس نے اُسے دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو۔
سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو۔

مگر وہ بات کہی جا چکی تھی جسے کہنا ایک فن بھی ہے اور واردات بھی
.... ! صبح تک نیند کی گولیاں اثر کرتی رہیں، آنکھ کھلی تو اخبار پہ نظر
پڑی۔ میں نے پُر اُمید نظروں سے اُسے اُٹھا کر دیکھا۔

"دیوانے کا کھویا ہوا دوسرا مجسّمہ دستیاب"

اور نہ جانے کیا کیا ...... آنکھوں کی برسات آج رُکنے والی نہیں تھی۔۔۔
جیسے تیسے وقت گزارا۔ رات کے پہلے پہر ہی میں نے خوابوں کی چادر سرکا
دی ...... اور گیرج سے کار نکالتے ہوئے کئی اندیشے دل میں سلگ
اُٹھے ......

گاڑی کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔ آج وہ خوابوں کی دنیا میں
میرا منتظر نہیں وہ یقیناً اُسی موڑ پہ میرا منتظر ہو گا جہاں سے روزانہ
گزرتی رہی ہوں۔ جہاں پہلی بار اُس سے ملی تھی۔۔۔
میری کار تیزی سے شہر کے اُس گنجان علاقے میں داخل ہو گئی
جہاں سے اُس کے وجود کی سرحد شروع ہوتی تھی۔ سڑک پر لگے قمقمے

خجلی خجل سے نظر آئے۔ چاند تاروں کی روشنی میں بھی آسمان کا چہرہ دھندلایا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔

عمارتوں کی پرچھائیوں اور چند راہگیروں کے درمیان وہ کھڑا کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ میرا انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا، وہ کہہ رہا تھا۔

وہ آئے گی!

وہ ضرور آئے گی!! میری سانسیں تیز تر ہو گئیں۔۔۔۔۔۔

اور میں نے کار کو روکنے کی پوری کوشش کی لیکن گاڑی کے بریک تو فیل ہو چکے تھے۔

اور "وہ"۔۔۔۔۔ "وہ"۔۔۔۔۔ فریبِ تمنّا۔۔۔ حرفِ آرزو خوابوں کی چادر۔۔۔۔۔۔ سب کو میری گاڑی نے روند ڈالا تھا اب وہ وہاں نہیں تھا۔ میری ذات ادھوری رہ گئی تھی اُس کا وجود تمام ہو چکا تھا۔ حرفِ آرزو مٹ گیا تھا۔۔۔۔۔۔ آگے جا کر میری گاڑی دیوار سے ٹکرا گئی۔ راہگیروں نے مجھے پکڑ لیا، پولیس بلوائی گئی میرے زخم دیکھے بغیر مجھے حراست میں لے لیا گیا۔۔۔۔۔۔ اور میں نے عدالت میں اقبالِ جُرم کرتے ہوئے کہا کہ "میں نے عمداً اُسے اپنی گاڑی سے کچل ڈالا۔"

مجھے سزائے موت سُنائی گئی لیکن اس سے پہلے مجھے آخری خواہش

پر یہ تحریر لکھنے کی اجازت دی گئی اور میں قریب تمنّا۔۔۔۔ حرفِ آرزو
۔۔۔۔ خوشگوار لمحے۔۔۔۔۔ خوابوں کی چادر سمیٹ کر اُس کے پاس
جا رہی ہوں ؎

اُس کو جہاں چھوڑا تھا میں نے
اب بھی وہیں وہ ٹھہرا ہوگا

میں۔۔۔۔۔ جا رہی ہوں۔۔۔۔۔ اُس کے پاس۔۔۔۔۔
اُس۔۔۔۔۔ ہاہا۔۔۔۔۔ ہاہا۔۔۔۔۔ ہاہاہاہا۔۔۔۔۔ ہاہا۔۔۔۔

ایڈوکیٹ شاہنواز وہیں چیر پر بیٹھے صبح کے اخبار پر نظریں دوڑا رہے تھے۔ آخری صفحے پر جلی حرفوں میں نمایاں خبر پڑھ کر چونک پڑے۔

"سزائے موت کی مستحق خاتون پاگل خانہ میں زندگی کی منتظر۔ نشاط زبیری نے نواب نصیر الدین خاں کو اپنی گاڑی سے ٹکر دے کر ہلاک کرنے کی پاداش میں سزائے موت کے فیصلے پر احتجاج کیے بغیر اپنی آخری خواہش ایک تحریری شکل میں تکمیل کرتے ہوئے دماغی توازن کھو دیا۔ ماہر ڈاکٹر نشاط زبیری کی صحت سے مایوس۔"

یہ خبر نشاط بیگم کی تصویر کے ساتھ دی گئی تھی۔

ایڈووکیٹ شاہ نواز کی آنکھوں سے ماضی بوند بوند ٹپکنے لگا۔ کاش نشاط کو انہوں نے نہ چھوڑا ہوتا تو وہ دوسری شادی کے بعد خود بھی چین سے نہ جی سکے۔ دوسری بیوی کے بھائیوں نے دولت کی لالچ میں ان پر اُس وقت حملہ کر دیا جب وہ اپنے شہر گاؤں سے واپس ہو رہے تھے۔ بعد میں ان کی بیوی کو جب پتہ چلا کہ شوہر کو مار کر رقم لوٹ لینے والے خود اُن کے بھائی تھے تو غیرت مند خاتون نے نیند کی گولیاں بھاری تعداد میں کھالیں۔

اور شاہنواز اب بھی زندہ ہیں مگر وہیل چیئر پر ـــــ!!!